رجسٹرڈ نمبر ا ے ۷۸۱ جنوری سنہ ۱۹۳۹ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت :- پانچ روپیہ (۵) سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڑھ

سیرۃ النبی ؐ

رسول اللہ صلعم کے حالات وغزوات، اخلاق وعادات اور تعلیم وارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ جس کا نام **سیرۃ النبیؐ** عام طور سے مشہور ہے، مسلمانون کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھکر صحت واہتمام کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے،

ابتک اس کتاب کے پانچ حصے شائع ہوچکے ہین، پہلے مین ولادت سے لیکر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہین، اور ابتدا مین ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہی جسمین فن سیرت کی تنقید و تاریخ ہی، دوسرے حصہ مین تکمیل دین، تاسیس حکومتِ الٰہی، وفات، اخلاق و عادات، اعمال و عبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہی، تیسرے حصہ مین آپکے معجزات و خصائصِ نبوت پر بحث ہے اسمین سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثین کیگئی ہین، پھر ان معجزات کی تفصیل ہی جو بروایات صحیحہ ثابت ہین، اسکے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید و تفصیل کیگئی ہے، چوتھے حصہ مین ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے جو آپکے ذریعہ مسلمانون کو تعلیم کئے گئے ہین، کوشش کی گئی ہی کہ اس مین قرآنِ پاک اور احادیثِ صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائین، پانچوین حصہ مین عبادت کی حقیقت، عبادت کی تفصیل و تشریح اور ان کے مصالح وحکم کا بیان ہی، اور دوسرے مذاہب کے عبادات سے ان کا مقابلہ وموازنہ ہے،

چھٹا حصہ جو اخلاق پر مشتمل ہی، تقریباً چھپ گیا ہی، مارچ کے شروع مین انشاء اللہ شائقین کے ہاتھون مین پہنچ جائیگا۔

قیمت باختلاف کاغذ حصہ اول تقطیع خورد للعہ ر، حصہ دوم تقطیع کلاں ؎ ر تقطیع خورد ۵ھ و ۴ھ، حصہ سوم تقطیع کلاں ؎ ر للعہ ر تقطیع خورد معہ ر و صہ حصہ چہارم تقطیع کلاں مے ر و ؎ ر تقطیع خورد معہ ر و صہ، حصہ پنجم تقطیع کلاں صہ ر وللعہ ر،

(منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ)

جلد ۴۳ | ماہ ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ مطابق ماہ جنوری سنہ ۱۹۳۹ء | عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

قومون کی ترقی کا اصول ہمیشہ ایک رہا ہے، چند سچی حقیقتون پر مستحکم یقین، اور اس یقین کے مطابق عمل اور کامیابی کے لئے مسلسل جدوجہد، سعی و محنت، اور اس راہ مین جو تکلیف و مصیبت پیش آئے اس کو ہنسی خوشی جھیل لینا، زمانہ کی اصطلاحین بدلتی رہینگی لیکن اصطلاحون کے بدلنے سے حقیقتین نہین بدلتین، اسلام کی اصطلاح مین اس مستحکم یقین کا نام ایمان، اس کے مطابق عمل کا نام عملِ صالح اور مسلسل جدوجہد اور سعی و محنت کا نام جہاد، اور اس کے لئے پامردی کا نام صبر و ثبات ہے، دنیا مین جب کسی قوم کو کامیابی ہوئی ہے تو اسی اصول کے مطابق ہوئی ہے، اور جب ہوگی تو اسی اصول کے مطابق ہوگی،

جانی اور مالی ایثار اس جدوجہد کی لازمی حقیقتین ہین، جنکو قرآنِ پاک کی اصطلاح مین جہاد بالمال اور جہاد بالنفس کہتے ہین، دنیا کی کوئی تحریک اس مالی اور جانی جہاد کے بغیر نہ کامیاب ہوئی ہے، نہ ہوگی، مذہبی تحریکون کو جانے دیجئے، آج سیاسی اور اقتصادی تحریکون کا دور ہے، ان مین سے کونسی تحریک کی گاڑی ان دو پہیون کے بغیر چل رہی ہے، روس کا انقلاب، جرمنی اور اٹلی کا نسزم، اسپین مین جمہوریت اور آمریت کا تصادم فلسطین کی شہادتگاہ، ان مین سے کہان ان دو کے بغیر کامیابی نصیب ہوئی ہے یا ہوگی، پھر ہندوستان کے مسلمان اس عرصۂ حیات مین کچھ انوکھی مخلوق

نہین، کہ ان کے لئے دنیا کا اصول بدل جائیگا، اور اللہ تعالیٰ ان کیلئے اپنے قانونِ قدرت کو توڑ دیگا،

اب پوچھنا یہ ہے کہ مسلمانون نے اس ملک مین اپنے قومی و سیاسی ایمان کے لئے کونسی چند حقیقتون اور سچائیون کو اپنی زندگی کا نصب العین بنایا ہے؟ اور اس کے حصول کے لئے وہ کونسی سرفروشی اور قربانی کر رہے ہین،

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ سلبی اور ہنگامی حقیقتین کبھی دائمی سربلندی کا جوش و خروش نہین بخش سکتین، سکھون اور مرہٹون کی قوتون کی جوانامرگی کے اسباب بتانے والے بہت کچھ بتا سکتے ہین لیکن میرے نزدیک تو اس کا جواب یہ ہے کہ مغلیہ سلطنت سے کینہ اور دشمنی، یا مسلمانون سے عداوت ہی فرض کر لیجئے، ان دونون قومون کا ایسا ہنگامی جذبہ تھا، جو پورا ہو جانے کے بعد خود بخود ختم ہو گیا، اور بقا اور استحکام حاصل نہ کر سکا، آریہ سماج تحریک کا حشر بھی اس سے زیادہ نہین،

اب مسلمانون کو سمجھنا چاہئے کہ اگر کسی قوم سے مخالفت اور آزردگی ہی ان کی قومی و سیاسی کوششون کا محور قرار پائے تو ان کا یہ جذبہ کہانتک ان کو اونچا لے جا سکتا ہے اور ان کی سعی و محنت جدوجہاد اور جوش و خروش کو کبتک قائم رکھ سکتا ہے؟ جو طوفان اور سیلاب دم کے دم مین آتا ہے وہ اُسی طرح دم کے دم مین چلا بھی جاتا ہے،

ہمارے سامنے اسلام خود ایک بہت بڑی حقیقت اور صداقت ہے، وہ مذہب بھی ہے سیاست بھی ہے، اقتصاد بھی ہے، معاشرت بھی ہے، اس کے مذہبی و سیاسی و اقتصادی و اجتماعی پیغامون کو پھیلانا، مساوات اور عدل قائم کرنا، اسلامی احکام کی تبلیغ کرنا، دنیا سے سود، بدکاری، شرابخواری قماربازی اور ظلم کو جڑ پیڑ سے اکھاڑنا، اور ملک مین ایک نیا سیاسی و اقتصادی نظام قائم کرنا، ایسے

وہ فرائض ہین جن سے مسلمان غافل ہین، اور غیر مسلمان اس کے لئے آج دنیا مین کٹ مر رہے ہین، یہ نہین کہا جاتا کہ جس کے لئے وہ آج کٹ مر رہے ہین وہ عین اسلام ہی ہے بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ اسمین اسلامی نظام کی جھلک ہے، اب یہ خود ہمارا کام ہے کہ ہم آگے بڑھین اور اپنا مکمل سیاسی و اقتصادی نظام دنیا کے سامنے پیش کرین اور اس کے لئے کم از کم وہ جذبہ دکھائین جو اسپین مین جمہوریت اور فسزم کے حامی دکھا رہے ہین، وہان قومین نہین لڑ رہی ہین، بلکہ ایک ہی قوم کے دو حصے دو مختلف نظریون کے خاطر جان و مال کی بازی لگا رہے ہین

مسلمانون نے اسلام کے آغاز مین جو لڑائیان لڑین ان کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ کسی ایک مذہب کو زبردستی پھیلانے کیلئے تلوارین نیام سے نکالی گئی تھین لیکن آج سوشلزم اور فسزم کے باہمی مقابلہ مین جو تلوارین نیام سے باہر ہین کیا وہ بھی کسی خاص مذہب کو زبردستی پھیلانے کی خاطر نہین ہین، سوشلزم کے حامی کہینگے کہ قوم مین طبقون کی جنگ عوام کی بھلائی کے لئے چھیڑتے ہین، تو یہی تو اسلام کے حامی بھی کہتے ہین کہ ہم نے لوگون کی بھلائی کی خاطر تلوارین اٹھائین اور شہنشاہیون کو مٹایا، سود خوارون کا قلع و قمع کیا، سونے چاندی کے ٹھیکہ دارون کو نیست و نابود کیا، دنیا مین عدل و مساوات کی حکومت قائم کی، اور انسانون کو انسانون کا معبود بننے سے روکا،

آج زمانہ بدل گیا ہے، تو اصطلاحین بدل گئی ہین، لیکن حقیقت اپنی جگہ پر ہے، آج پھر اسلام کو اسی فرض کو ادا کرنا ہے، اگر آج کے کلمہ گو مسلمانون مین اس کے اس ادائے فرض کے سپاہی بننے کا ولولہ نہین تو کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ کسی اور قوم کو زندگی کے میدان مین لائے اور اس سے اسلام کا یہ فرض ادا کرائے

دنیا آج اپنی نجات کی راہ فسزم، نازی ازم، سوشلزم، کمیونزم، بالشوازم میں ڈھونڈ رہی ہے، حالانکہ اسکا ایک ہی راستہ ہے "اسلامزم" لیکن وہ اسلام وہ نہین جو آج عملاً مسلمانون مین ہے، بلکہ وہ جو قرآن و سنت مین ہے، آج کی وہ کونسی مشکلین ہین، جنکا حل ان مین نہین، ضرورت نئی نظر اور نئی قوت کی ہے،

مقالات

ارمغانِ احباب

یعنی

دلّی اور اس کے اطراف

آج سے پینتالیس برس پہلے

از مولانا حکیم سید عبدالحئی صاحب مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء

مولینا سید عبدالحئی صاحب سابق ناظم ندوۃ العلماء غدر کے بعد کے اُن نوجوان علماء میں ہین، جنہون نے اس فتنۂ مشرق مین آنکھیں کھولیں، اور زمانہ کے نئے تغیرات سے بہت حد تک متاثر ہوئے

موصوف کی پیدائش ۱۲۸۶ھ میں دائرۂ شاہ علیم اللہ بیرون رائے بریلی میں ہوئی، اور اس خانوادہ میں ہوئی جس میں ابھی ابھی مجدد وقت امام الہند حضرت مولینا سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ظہور ہوا تھا، اور جو حضرت مولینا شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ کی تحریک کے مرکز عقیدت تھے،

مولینا سید عبدالحئی صاحب مرحوم نے اپنی اعلیٰ تعلیم بھوپال میں اس وقت حاصل کی جب نواب صدیق حسن خان کے عہد مین بھوپال فضل و کمال کا مرکز بنا ہوا تھا، اور قاضی شوکانی کے حلقۂ فیض سے مستفید شیخ حسین صاحب یمنی خزرجی درس حدیث کی مسند پر متمکن تھے، مولینا نے شیخ صاحب سے حدیث کی سند حاصل کرنے کے بعد ۱۳۱۲ھ میں جب وہ چھبیس سال کے تھے، دہلی اور اس کے اطراف کے بزرگوں کی خدمت سے فیض اٹھانے کا ارادہ کیا،

اور اسی سلسلہ مین پہلے دہلی کا، اور پھر آس پاس کے دوسرے شہروں کا سفر کیا، اور بزرگوں کی ملاقات سے فیض حاصل کیا، اور اس علمی سفر کی روداد کو روزنامچہ کے طور پر اسی زمانہ میں وہ قلمبند بھی کرتے گئے، جس کا نام انھوں نے "ارمغانِ احباب" رکھا،

یہ مسودہ مرحوم کے چشم و چراغ مولوی سید ابوالحسن علی صاحب ندوی (مدرس دارالعلوم ندوۃ العلما) کے توسط سے میں نے دیکھا، اور اس کے مطالعہ سے بڑا لطف اٹھایا، اور جی چاہا کہ اس ارمغانِ احباب کو احباب تک پہنچاؤں،

یہ دیکھنے کی چیز ہے کہ نوجوان علما پر اردو ادب کے انقلاب کا اثر کتنا جلد پڑ گیا تھا، پرانی طرزِ تحریر کے بجائے صاف اور سادہ لکھنے کی مشق کس حد تک ہو چکی تھی، مرحوم مؤلف اس زمانہ تک "نیچریوں" کے اثر سے بالکل پاک تھے، بلکہ اس کیمپ میں تھے، جو ان کے بالمقابل کھڑا کیا گیا تھا، تاہم خیالات کے انقلاب کی تاثیر وہاں تک پہونچ چکی تھی،

لحاظ کے قابل دوسری چیز یہ ہے، کہ اس وقت تک تباہی و بربادی کے باوجود اسلاف کی کتنی یادگار صورتیں اور نشانیاں باقی تھیں، ایک اور خیال رہے، کہ یہ وہ زمانہ تھا، جب پورے ملک میں مقلد اور غیر مقلد کی بحث پھیلی ہوئی تھی، اور اس آگ کے شعلے اچھے اچھوں کے دامن تک پہونچ چکے تھے، "س"

بسم اللہ الرحمن الرحیم

روز شنبہ ۱۴ ر رجب سنہ ۱۳۱۲ھ، آج خدا کے فضل و کرم کے بھروسہ پر میں اپنے سفر کو شروع کرتا ہوں، یہ سفر بھی میرا خدا کے فضل سے علم دینی کے طلب کی غرض سے ہے، اسٹیشن[1] تک اعزۂ وطن مشایعت

[1] یہ سفر قصبہ ہسوہ ضلع فتحپور سے شروع ہوا تھا، جو مولینا کا ننہال اور انکی سسرال بھی ہے،

میں میرے ساتھ آئے، اور تین بجکر بارہ منٹ پر مین پسنجر پر سوار ہوا، البتہ دہلی تک محصول پڑا، فتحپور پہونچکر مولوی ظہور الاسلام[1] صاحب سے ملاقات ہوئی، وہ شیخ محمد حسین صاحب کو پہنچانے آئے تھے، شیخ محمد حسین صاحب حج کو روانہ ہوئے، مولوی نور محمد[2] صاحب بھی آئے تھے، ان سے بھی ملاقات ہوئی،

دہلی روز یک شنبہ ۱۵ ر رجب ،۔ ۱۱ بجے مین دہلی پہنچا، دہلی کو دور سے دیکھکر بڑی عبرت ہوئی، یہ شہر تقریبًا پانسو برس تک مسلمانوں کا دار السلطنت رہا ہے، اب انگریزی قبضہ میں ہے، صدق اللہ تعالی تلک الایام نداولہا بین الناس فانا للہ وانا الیہ راجعون، اسٹیشن سے بخط مستقیم چھناملی کی سرائے آیا، یہ سرائے بہت قریب ہے، بلکہ اسٹیشن ہی شہر سے متصل ہے، سرائے میں بھائی جی[3] بیٹھے تھے، ان سے ملاقات ہوئی، اب میں یہاں ٹھہرا ہوں،

سرائے سرائے کے دروازے نہر بہتی ہے، جس کا عرض تقریبًا ۱۲ ہاتھ ہوگا، اس کے اوپر سرائے سے تھوڑے فاصلہ پر مسجد ہے، یہ مسجد غازی الدین خان کی بنوائی ہوئی ہے، نہر کو پل کے طور پر پاٹ کر مسجد بنائی ہے، ظہر کی نماز میں نے اس میں پڑھی، نماز پڑھکر میں اور بھائی جی خراماں کمپنی باغ دیکھنے گئے، یہ باغ اسٹیشن کے محاذی، اور سرائے کے بہت ہی قریب ہے، باغ بڑا ہے، لیکن معمولی ہے،

مدرسۂ طبیہ باغ سے آکر میں مدرسۂ طبیہ[4] حکیم فضل اللہ پسر حکیم عماد الحسن صاحب صفی پوری سے ملنے کی غرض سے گیا، یہ مدرسۂ طبیہ کی جماعت اول میں پڑھتے ہیں، آجکل بوجہ قرب امتحان کے ایام تعطیل میں

[1] مولوی سید ظہور الاسلام صاحب فتحپور کے ممتاز علما میں تھے، مولانا لطف اللہ صاحب کے شاگرد، اور مولینا فضل رحمن صاحب گنج مرادآبادی کے مرید تھے [2] مولینا نور محمد صاحب بھی بڑے عالم متشرع تھے، مولینا فضل رحمن صاحب سے فیض پایا تھا، اور مولینا لطف اللہ صاحب کے شاگرد تھے، فتحپور کے مدرسہ اسلامیہ میں مدرس اول تھے، وطن شاہ پور پنجاب تھا، مگر وفات فتحپور میں ہوئی، سال پیدائش سنہ ۱۲۷۳ھ تھا [3] بھائی جی سے مراد مولوی سید خلیل الدین صاحب رائے بریلوی مرحوم ہیں، جو علاج کی غرض سے ان دنوں دہلی میں تھے [4] مدرسۂ طبیہ سے مراد حکیم عبد المجید خان کا مدرسۂ طبیہ ہے، جو اب طبیہ کالج کہلاتا ہے،

کتابیں یاد کرتے ہیں، ان سے مدرسہ طبیہ کے حالات کم وبیش معلوم ہوئے، فن تشریح ڈاکٹری قاعدہ کے موافق خوب ہوتا ہے، ایک ڈاکٹر اسی غرض سے مدرسہ میں مقرر ہے، جماعت اول کے طلبہ مطب میں شریک ہوتے ہین، ہفتہ مین دو ہفتہ حکیم عبدالمجید خانصاحب کے پاس مطب میں نسخہ نویسی کرتے ہین، اور دو ہفتہ سول سرجن کے یہان شفاخانہ مین طریق علاج دیکھتے ہین، جماعت اول کے طلبہ امتحان کے بعد بھی ایک سال تک مطب کرتے ہیں، اوس وقت ان کو سند دیجاتی ہے، ہر جماعت کی خواندگی ایک سال میں ختم ہوتی ہے، چار جماعتیں ہیں، خواندگی ہر جماعت کی علحدہ علحدہ ہے، دواسازی میں بھی امتحان ہوتا ہے،

طرز تعلیم اس مدرسہ کا بہت اچھا ہے، مگر طرز مطب جہاں تک میں خیال کرتا ہوں ناکافی ہے، کیونکہ بیشتر مرکبات کا استعمال ہوتا ہے، علاج الامراض کے نسخے مطب میں معمول بہا ہین، بطور خود طلبہ ان کو یاد کرلیتے ہیں، تاہم کشتہ جات کے نسخے نہیں معلوم ہوتے، قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو طلبہ یہاں سے تعلیم چھوڑ کر لکھنؤ چلے جاتے ہیں، وہ پست ہمتی سے تعلیم کی محنت کو گوارا نہیں کرتے، ورنہ طرز تعلیم میں بظاہر کوئی نقص نہیں ہے،

مسجد فتحپوری

عصر تک مولوی فضل اللہ کے پاس میں رہا، ان سے اکر فتحپوری مسجد میں عصر کی نماز پڑھی، یہ مسجد نہایت عالیشان مسجد ہے، وسط کا درجہ بہت وسیع ہے، اس کے دونوں طرف بقدر ایک ایک صف کے چار چار درجے ہیں، ان درجوں کے وسط کے درجے میں محرابوں کے اوپر خط نسخ وکوفی میں آیتیں، اور اسماء الٰہی، اور کلمۂ طیب بہت خوب تحریر ہیں، درجہ وسطانی کے آگے زینہ پر منبر کے محاذی میذنہ بہت خوبصورت اور نہایت سبک سنگ خارا کا بنا ہے، اس پر نقش ونگار بہت خوب بنائے گئے ہیں، صحن مسجد کا بہت وسیع ہے، صحن کے کنارے حوض بہت وسیع بنا ہوا ہے کہ کئی زینہ اترکر پانی تک پہنچتا ہے، مسجد کے چاروں طرف غلام گردش بہت وسیع ہے مکانات

بہت بڑے بڑے بنے ہین، اور ان کے باہر سڑک کی طرف دوکانیں ہین،

مولوی سید نذیر حسین صاحب کی مجلس

یہاں سے میں مولوی نذیر حسین صاحب سے ملنے کی غرض سے حبش خان کے پھاٹک کے اندر گیا، اتفاق سے راہ میں مولوی صاحب مل گئے انکی مسجد گیا بعد تعارف کے میں نے مسلسل[1] بالاولیہ کی درخواست کی، مگر مولوی صاحب نے تبسم فرماکر دوسرے شخص سے مخاطب ہوکر کہا کہ ہمارے[2] حضرات کے یہان یہ کچھ باتین نہ تھیں، اس کے بعد اور لوگون سے باتیں کرنے لگے، اسی اثنا میں طلبہ نے فتوے پیش کئے، ان کو سنتے رہے، ایک استفتاء طلاق کے مسئلہ میں تھا، سوال یہ تھا کہ زید نے اپنے خسر کو لکھ بھیجا، کہ آپ کی بیٹی زیب النساء کو میں نے علی الاتصال ایک سال تک تین طلاق دی، اس سوال پر طالب العلم نے کہا کہ طلاق نہیں ہوئی، کیونکہ اس میں تخاطب شرط ہے، یہاں تخاطب نہیں ہے، مولوی صاحب نے کہا کہ تخاطب کئی طرح کا ہوتا ہے، ایک تخاطب بالتسمیہ، دوسرا تخاطب بالخطاب، تیسرا تخاطب بالاشارہ یہاں تخاطب بالتسمیہ ہے، اسکے بعد اسکو نصیحت کی کہ خوب غور وفکر سے مسئلہ کو دیکھا کرو، اس کے مناسب یہ حکایت بیان کی، کہ مصنف بحرالرائق دو بھائی تھے، بڑے بھائی بحرالرائق کے مصنف ہیں، دوسرے ابن نجیم بڑے بھائی کے متعلق افتاء تھا، دوسرے کے متعلق تدریس، ایک مرتبہ بڑے بھائی بیمار ہوئے، ان کی جگہ پر چھوٹے بھائی کام کرنے لگے، ایک مرتبہ رئیس نے یہ سوال بھیجا، کہ میں حمام میں جاتا ہون میرے ساتھ جواری بھی ہوتی ہین، ہم سب کا برہنہ ہونا جائز ہے یا ناجائز، انھون نے لکھدیا کہ جائز ہے، لکھکر بھیجدیا، اس کے بعد بڑے بھائی سے ذکر کیا، انھون نے کہا کہ تم نے بالکل غلط جواب دیا، گو سائل کو ان جواری کا برہنا دیکھنا جائز ہے، لیکن ان کو باہم ایک دوسرے کو برہنا دیکھنا نادرست ہے،

---

[1] ایک حدیث کی سند جو آنحضرت صلعم سے شیخ وقت تک مسلسل چلی آتی ہے، اور لوگ تبرکاً اسکی سند حاصل کرتے ہیں، [2] ہمارے حضرات سے مقصود شاہ ولی اللہ صاحب کا خانوادہ ہوگا،

دوسری حکایت یہ بیان کی کہ مفتی یوسفؒ صاحب لکھنوی کے پاس یہ سوال آیا، کہ ایک شخص نے اپنی زوجہ کی حقیقی بہن سے نکاح کر لیا، اور اس سے اولاد ہوئی، آیا نسب صحیح ہے، اور وہ ترکہ کا مستحق ہو، یا نہیں، انھون نے جواب لکھا نسب صحیح ہے، اور جب نسب صحیح ہے، تو ترکہ بھی پا سکتا ہے، یہ جواب جب مفتی صدر الدین خانصاحب کے پاس آیا، تو میں نے کہا کہ یہ غلط ہے، نکاح فاسد کی صورت میں نسب متحقق ہوتا ہے، مگر ترکہ کا استحقاق نہیں حاصل ہوتا، مفتی صاحب کو بہت استعجاب ہوا، میں نے کہا کہ افتا اور چیز ہے، اور تدریس اور چیز، لِکُلِّ فنٍ رِجال، ان باتون کے بعد مغرب کا وقت آگیا، میں نے بھی نماز وہیں پڑھی، نماز میں اکثر بلکہ کل غیر مقلد تھے، نماز کے بعد رفع ایدیؑ فی الدعا، کا دستور نہین ہے، نماز کے بعد مولوی صاحب اپنی صاحبزادی کے گھر گئے، رات کے کھانے کا شاید یہیں معمول ہو، اور میں ایک طالب العلم سے درس کے اوقات پوچھکر سرائے واپس آیا،

مولوی سید نذیر حسین صاحب کا درس

روز دوشنبہ ۱۶ رجب، حوائجِ ضروری سے فارغ ہو کر ۸ بجے مولوی نذیر حسین صاحب کے مدرسہ گیا، بخاری شریف کا درس ہو رہا تھا، شریک ہو گیا، ۱۱ بجے تک متعدد کتابوں کے درس ہوئے، سب میں شریک رہا، ابتدا میں معمولی طریقہ تھا لیکن تھوڑی دیر کے بعد معمول سے زیادہ مولوی صاحب ممدوح موشگافیاں فرمانے لگے، میرا گمان یہ ہے (ان بعض الظن اثم) کہ پیشتر مولوی صاحب نے درس کی مشغولی کی وجہ سے مجھکو نہیں دیکھا، جب انھون نے مجھکو دیکھا، تو اس کے بعد ہی انھوں نے طرز بدل دیا، ۱۱ بجے اٹھے، میں بھی ساتھ ہی ساتھ اٹھا، مجھ سے فرمایا کیسے چلے؟ میں نے عرض کیا کہ صرف سماعت کی غرض سے حاضر ہوا تھا، کہنے لگے میان

سلہ مولینا مفتی یوسف صاحب فرنگی محلی، لکھنو میں نوابی کے زمانہ میں مفتی تھے، اس کے بعد جونپور کے مدرسہ میں مدرس ہوئے، اپنے زمانہ کے مشہور مدرس علما، میں تھے، مولینا فاروق صاحب چریا کوٹی کے استاد تھے، ۱۲۸۶ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی سلہ نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا،

تم پڑھے لکھے ہو جوان صالح ہو کہیں بیٹھ کر خود پڑھاؤ، میں بوڑھا آدمی کثیر الامراض، ہوش و حواس باختہ سترا بہترا ہوں، میرا پڑھنا پڑھانا کیا، از سرتا پا عوارض میں مبتلا ہوں، اس کا جواب میں نے مناسب الفاظ میں دیا، جیسا ایک ارادتمند کو زیبا ہے، اس پر مولوی صاحب نے فرمایا کہ پھر صبح سے آیا کرو تاکہ سب سبقون میں شریک ہو سکو، میں سلام کر کے واپس آیا،

مولوی حفیظ اللہ صاحب دہلوی واعظ

راستہ میں معلوم ہوا کہ آج دوشنبہ کا دن ہے، مولوی حفیظ اللہ صاحب واعظ دہلی غازی الدین خاں کی مسجد میں اس دن ہمیشہ صبح سے وعظ فرماتے ہیں، میں بھی جا کر وعظ میں شریک ہوا، سورۂ یونس کا بیان تھا، وعظ سن کر سرائے واپس آیا،

مولوی سید نذیر حسین کا درس

ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر پھر میں گیا، درس ہو رہا تھا، بخاری شریف کے درس کے بعد ہدایہ کا درس شروع ہوا، یہ بالکل معمولی تھا، قاری ترجمہ بھی نہیں کرتے تھے، کہیں کہیں حاصل ترجمہ مولوی صاحب بیان کر دیتے تھے، کہیں پر قاری صاحب، اوس کے بعد اور سبق حدیث کے ہوے، پھر عصر کی اذان ہوئی، نماز میں بھی شریک ہوا، ایک مثل کے بعد ہی نماز ہوئی، نماز کے بعد لوگوں نے دعا مانگی، میرا خیال غلط تھا، رفع ایدی کے ساتھ بعض بعض لوگون نے دعا کی، اور بعض قبل دعا کے اٹھ گئے، مولوی صاحب بھی سلام پھیرتے ہی قبل دعا کے اٹھکر جا درس پر جا کر بیٹھ گئے، نماز دوسرا شخص پڑھاتا ہے، نماز کے بعد بھی دو ایک سبق ہوئے،

چاندنی چوک اور جامع مسجد

اوس سے فارغ ہو کر ۴ بجے کے بعد مولوی صاحب مکان گئے، اور میں بھی واپس آیا، وہان سے آکر دیکھا تو بھائی جی نہ تھے، تفریحاً کہیں چلے گئے تھے، میں بھی چاندنی چوک کی طرف تفریحاً چلا، دل میں آگیا، کہ چاندنی چوک کی پوری سیر کر لینی چاہئے، اس خیال میں قلعہ تک چلا گیا، واقعی اس میں شک نہیں کہ یہ شہر اپنی حسن و لطافت میں بے نظیر ہے، قلعہ تک پہونچکر واپس ہوا تھوڑے ہی فاصلہ سے جامع مسجد کو سڑک جاتی تھی، اوس پر ہو لیا، جامع مسجد پہونچکر

اس کی حسن و خوبی کے لحاظ سے حیرت ہو گئی، میں دیر تک ششدر اوس کے نقش و نگار کو دیکھتا رہا
مجھ میں واقعی اتنی قدرت نہیں کہ اسکی واقعی تعریف کر سکوں، اور اس کے واسطے ایک فرد درکار ہے،

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم　　کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

وہ ایک خدا کی عظمت کا نمونہ ہے، گویا فرشتوں نے اپنے پاک ہاتھوں سے اسکی تعمیر کی ہے، یا شاہجہان انار اللہ برہانہ کی نیک نیتی کی مجسم تصویر ہے، جب تک رہا محو حیرت رہا، یورپین مرد و عورت جوق جوق دیکھنے کو آتے ہین، اور جوتے پہنے ہوئے تمام مسجد میں گشت کرتے ہین، مغرب کا وقت آگیا اور میں نے مغرب کی نماز جماعت کیساتھ وہیں ادا کی، نماز کے بعد میرے دل نے بے اختیار مجھکو آمادہ کیا، کہ بانی مسجد کے واسطے دل سے دعا کروں، چنانچہ میں نے دعا کی، اوس کے بعد وہاں سے سرائے واپس آیا،

اب تک مجھ کو اجنبیت کی وجہ سے اور نیز مولینا سید نذیر حسین کے یہاں دونوں وقت حاضر ہونے کی وجہ سے اس بات کا موقع نہیں ملا، کہ شہر خموشاں کی سیر کروں اور مشائخ کی ارواح کو فاتحہ پہنچاؤن، یہ بات یاد سے جاتی رہی کہ مولینا ممدوح نے مجھ سے فرمایا تھا، کہ تم سرائے میں ٹھہرے ہو، بے سود خرچ کثیر کے متحمل کب تک ہو سکو گے، یہاں اُٹھ آؤ، میں نے عرض کیا کہ میرے بھائی پیشتر سے علاج کی غرض سے وہاں ٹھہرے ہوئے ہین، انہی کے پاس آکر ٹھہر گیا، اگر تنہا ہوتا تو بیشک یہان اُٹھ آتا، رات بھر بارش خوب ہوئی، راستہ خراب ہو گیا ہے، چلنے کے قابل نہیں ہے،

روز شنبہ ۱۰ رجب۔　اس وقت بھی ابر و باد ہے، اور راستہ بالکل خراب ہے، لیکن میں مولینا ممدوح کے پاس جانے کو تیار ہون، ۸ بجے مولوی صاحب کی درسگاہ جو میرے قیام گاہ سے بہت قریب ہے، گیا، راستہ ایسا خراب ہے کہ چار قدم چلنا مشکل معلوم ہوتا ہے، وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ بخاری شریف کا سبق شروع ہو گیا ہو، اس میں شریک ہو گیا، اس کے بعد

مقدمۂ صحیح مسلم ہوا، بالکل سادہ سادہ درس ہے، مالہ و ماعلیہ سے بحث نہیں ہوتی، اس کے بعد بیضاوی کا سبق شروع ہوا، مولوی صاحب کے بھتیجے مولوی عبدالحفیظ پڑھتے ہین، اس کا سبق بالکل خراب ہوتا ہے، پڑھنے والے قطعاً نہیں سمجھتے، عبارت بالکل غلط پڑھتے ہیں جس سے سننے والا بھی صحیح مطلب نہیں اخذ کر سکتا، مولوی صاحب کی نسبت سوء فہم کا گمان سوء ظن ہوگا عجب ہے کہ کبرسنی کی وجہ سے اخذ مطلب کے متحمل نہ ہو سکتے ہون، شواہد میں اعشیٰ کا ایک شعر آگیا، اس میں دیر تک قاری اور سامع متوجہ رہے، مگر پھر بھی ناکامیاب ہوئے، مولوی صاحب نے فرمایا کہ حل الابیات ہمارے پاس ہے اس میں خوب حل کر دیا ہے، میرے دل میں بار بار آتا تھا کہ میں کچھ بولون، مگر مولوی صاحب کی خفگی کی وجہ سے نہیں بولا، وہ بہت جلد خفا ہو جاتے ہیں، اور طالب علموں کو الفاظ سخت و درشت کہتے ہیں،......... یہ مصرع بہت پڑھتے ہیں، ع

عیسے کے اصطبل میں کوئی خر بھی چاہیے[1]

اور طالب العلم ان کا سننا بھی فخر و سعادت سمجھتے ہین، یہ روسیاہ ان باتوں کے سننے کو بسبب اجنبیت کے گوارا نہیں کر سکا، افسوس ہے کہ بیضاوی بالکل نام ہی کے واسطے پڑھی جاتی ہے، کاش اس کی جگہ پر حدیث کا سبق ہوتا تو گو وہ نہ سمجھیں لیکن الفاظ نبوی کے ادا ہونے سے ثواب میں داخل ہوتے، مولوی صاحب نے اثنائے سبق میں بیضاوی کی نسبت بھی الفاظ ناملائم کہے، کہ وہ فلسفی تھا، یہ کچھ نہیں سمجھتا، آیات بینات کو اپنی قابلیت جتانے کے واسطے مشکل کر دیا ہے، شاہ ولی اللہ صاحب کبھی اسکو نہیں دیکھتے تھے، ان کو اسکی طرف بالکل اعتنا نہ تھا، الیٰ آخرہ،

اس کے بعد اور سبق ہوتے رہے، میں نہایت خاموشی کے ساتھ سنتا رہا، طالب العلم اکثر مجھد

[1] مولینا از روے مطائبہ جیسا کہ آگے آیگا طلبہ کو یہ کہا کرتے تھے، مگر مولینا سید عبدالحی صاحب چونکہ فطرۃً نہایت سنجیدہ اور متین تھے، اسلئے انکو یہ طریقہ پسند نہ آیا ہوگا، "س"

بھی ہیں، لیکن متعصب اور بیباک حنفیہ کے اقوال کی طرف بالکل اعتنا نہیں کرتے، بلکہ کبھی کبھی نام آتے ہی ناک بھوں چڑھاتے ہین، ۱۱ بجے وہاں سے واپس آیا، ظہر کی نماز پڑھکر پھر مولوی صاحب ممدوح کے یہاں گیا، کچھ میں سویرے گیا تھا، کچھ مولوی صاحب کے آنے میں دیر ہوئی، اس اثنا ئمیں مولوی ابوالحسن صاحب مولوی صاحب ممدوح کے پوتے نے مجھ سے کہا کہ آپ کو اگر سند لینا ہو تو میاں صاحب سے کہئے، میں نے کہا کہ بیشک ارادہ ہے ایک دو روز میں عرض کروں گا، تھوڑی دیر مین مولوی صاحب تشریف لائے، بخاری کا سبق شروع ہوا اس کے بعد ہدایہ کا سبق ہوا، سبق اسی طور پر معمولی تھا، اثنائے سبق میں ایک قول کے نسبت کچھ پڑھنے والے نے شک ظاہر کیا، مولوی صاحب نے فرمایا آگے چلو بیوقوف ہو، آگے چل کر دو قول تھے، انھوں نے کہا عجیب طرح کا اختلاف ہے، یہ کیسے ہوسکتا ہے، یون ہونا چاہئے، مولوی صاحب نے کہا اب تم یہ حاشیہ پر لکھدو کمیٹی کی وہ رائے ہے، تمھاری یہ کچھ خدا و رسول کی طرف سے یہ باتیں تو ہیں نہیں، جسکی جیسی رائے ہو، میں ان سب باتوں کو سکوت کے ساتھ سنتا رہا، میرے بولنے کا کوئی موقع نہ تھا، کیونکہ بادی النظر میں میں استفادہ کا منصب رکھتا ہوں، البتہ ذوق کا یہ شعر لسانِ حال سے پڑھا جاتا تھا،

جو کہو گے تم کہیں گے ہم بھی ہاں یونہی سہی آپکی گر یوں خوشی ہے مہربان یونہی سہی

اوس کے بعد اور سبق ہوتے رہے، یہاں تک کہ عصر کی نماز ہوئی، میں نماز پڑھتے ہی چلا آیا، کیونکہ آج مجھ کو حکیم صاحب کے یہاں جانا تھا، وہاں سے آکر بھائی جی کیساتھ حکیم صاحب کے یہان گیا، حکیم صاحب نہ تھے، بھائی جی اون کے انتظار میں بیٹھے رہے، میں مولوی فضل اللہ سے ملنے چلا گیا، اتفاق کہ وہ بھی نہ ملے، وہاں سے لوٹ کر میں نے قمرالدین برادر زادہ قاضی امیر علی کو مدرسہ میں تلاش کیا، وہ وہاں نہ تھے، دوسری جگہ تلاش کرنے سے ملے، ان سے میں نے کہا، کہ ایک کلام مجید تمھارا میں لایا ہوں کل ۱۱ بجے آکرے لو، غالباً وہ کل آوین،

میں وہاں سے چاندنی چوک آیا، قصد تھا کہ جامع مسجد جاکر وہاں کسی سے تعارف پیدا کرکے یہاں کے مقامات کے حالات پوچھوں، مگر راستہ میں ایک پادری اور دوسرے مسلمان مولوی سے مناظرہ ہورہا تھا، اسکو سننے لگا، اتنے میں مغرب کا وقت آگیا، میں فسخِ عزمیت کرکے لوٹا، کیونکہ جامع مسجد دور تھی، اثنائے راہ میں مسجد فتحپوری میں نماز پڑھکر اسوقت قیامگاہ پر واپس آیا ہوں،

افسوس ہے کہ مولینا نذیر حسین صاحب کے یہاں دونوں وقت حاضر ہونے کی وجہ سے ابتک یہاں کے دوسرے مساجد و نیز مقاماتِ متبرکہ کی سیر کا موقع نہیں ملا، اگر مغرب کے قریب کچھ وقت ملتا ہے، تو وہ اس قابل نہیں ہوتا، کہ دور دراز مقامات کی سیر ہوسکے، راستہ ایسا خراب ہے، کہ چار قدم بھی چلنا مشکل ہے، یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے، کہ مولوی نذیر حسین صاحب بہت خوش مزاج ہیں، مطائبہ بہت کرتے ہیں، ان کو اشعار بہت یاد ہیں، سبق میں اکثر اشعار خواجہ حافظ وغیرہ کے اور اردو کی مثلیں اور محاورات استعمال کرتے ہین، طالب العلموں کو اس طور پر ڈانٹتے ہیں، کہ ان کو ناگوار نہیں ہوتا، گو سخت الفاظ میں ہو، غصہ ور بھی معلوم ہوتے ہیں، اپنے خلاف بات سننے کے متحمل نہیں ہیں، حنفیہ کیساتھ تعصب بھی بہت ہے، ایک شخص نے آکر پوچھا کہ چوہا کنوئین میں گر گیا ہے، اور سڑ گیا ہے کتنا پانی نکالا جائے، اس کو سن کر پہلے استہزا کرتے رہے، کہ مٹی بھی کھود کر پھینکدو، اس کے بعد کہنے لگے بیوقوف اس سے کیا ہوتا ہے، . . . . پھر کہا کون پوچھتا ہے، سائل نے کہا میں ہوں، کہا اگر عوام[۱] کے شور و غل مچانے کا موقع ہو توان بیوقوفوں کو دکھانے کو کچھ نکال ڈالو، بلکہ انہی احمقوں کو لگادو وہ محنت کرین گے، جیسے کو تیسا، ہم کو بھی یہ ترکیبیں آتی ہیں، مولوی صاحب کی ڈانٹ ڈپٹ کے بعض انداز ہمارے مولینا فضل رحمن[۵۲] صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ سے بہت ملتے ہین، مزاج میں سادگی بہت ہے

---

۵۲ حضرت مولینا شاہ فضل رحمن صاحب گنج مرادآبادی،

روز چہار شنبہ ۱۰ رجب۔ صبح کو حوائجِ ضروری سے فارغ ہو کر درسگاہ گیا، آج بہ نسبت اور دنوں کے سویرے آیا ہوں، ترجمہ کلام مجید کا سبق ہو رہا ہے، اس سبق میں اس قدر لوگ شریک ہیں جن سے مسجد اندر اور باہر بھری ہوئی ہے، تقریباً چالیس پچاس آدمی ہوں گے، کل طالب العلم و بعض بعض شائقین حلقہ درس میں بیٹھے ہیں، صبح کی نماز کے بعد ہر روز سب سے پیشتر ترجمہ کا سبق ہوتا ہے، مولوی صاحب کا معمول ہے، کہ اثنائے سبق میں اکثر تمثیلیں اور حکایات و اشعار بیان کرتے ہیں، اس سبق کا بھی وہی دستور ہے ایک شخص پڑھتا جاتا ہے، اور خود حاصل مطلب بیان کرتے جاتے ہیں،

اس سبق کے بعد مقدمہ صحیح مسلم شروع ہوا، لوگ متفرق ہو گئے، طالب العلم رہ گئے، اثنائے سبق میں مولوی فضل حق[1] و مفتی صدر الدین صاحب مرحوم کے قصے بیان کئے، کہ یہ ارباب دنیا تھے، اسی وجہ سے دنیا میں بھی بحیثیت تدین کے ان کی وقعت کم تھی، یہ قصہ بھی بیان کیا، کہ مولوی اسماعیل صاحب رحمۃ اللہ علیہ بلی ماران کی مسجد میں وعظ کہتے تھے، چونکہ مولوی فضل حق کو انسے تعصب تھا، اور وہ سررشتہ دار محکمۂ فوجداری میں تھے، اس واسطے انہوں نے کوتوال کو وعظ سے روکنے کے واسطے بھیجا، کوتوال مولوی صاحب کے وعظ سے ایسا متأثر تھا کہ روتا ہوا مولوی صاحب کے سامنے آیا، اور کہا کہ میری کیا طاقت جو وعظ سے منع کروں، لیکن افسوس یہ ہے کہ وہ یہ حکم دیتے ہیں، میں مجبور ہوں، یہاں سے نکل کر آپ بیان کریں تو مناسب ہے،

اُس کا انجام دیکھئے کہ مولوی صاحب ایک شادی میں شریک تھے، گرمیوں کے دن تھے، پلاؤ کھایا ہوگا، ناچ رنگ ہوتا رہا، جس مکان کے بالاخانہ پر یہ جلسہ تھا، وہاں جتنے ظرف پانی کے تھے، سب میں کسی نے جمالگوٹہ ملا دیا، اور آمد و شد کا راستہ بند کر دیا، یعنی زینہ کے دروازہ میں باہر سے قفل لگا دیا، وہاں پلاؤ کھانے کی وجہ سے پیاس کی شدت میں لوگ خوب پانی پیتے رہے،

[1] مولینا فضل حق صاحب خیرآبادی معقولات کے مشہور علماء میں تھے، دہلی میں سررشتہ دار تھے،

اور دست آنے شروع ہوئے، حاضرین وارباب نشاط سب اس مصیبت میں مبتلا ہو گئے، راستہ بند ہونے سے اور پریشانی پھیلی، وہیں سب اپنی اپنی حالت میں تھے، اور شدتِ گرمی سے پانی پیتے جاتے تھے، کسی کو یہ خبر نہ تھی، کہ اس پانی میں زہر گھلا ہوا ہے، رات جو پولیس کے جوان روند میں ادھر آنکلے، تو شور و غل سن کر اوپر چڑھے، دروازہ توڑا تو لوگوں کی یہ حالت دیکھی، ان میں مولوی صاحب بھی تھے جیسی کچھ خفت ان کو ہوئی وہ ظاہر ہے، کسی کو یہ بات نہ سوجھی تھی، کہ پانی ہی میں یہ بلا ہے، پیتے تھے، اور دست پر دست آتے تھے، آخر الامر کسی کو یہ بات سوجھ گئی، اس نے کہا یارو کہیں پانی میں کسی نے کچھ شرنہ کیا ہو، اس کے سنتے وہ لوگ رُک گئے،

اثنائے سبق میں اس بات کا بھی ذکر ہوا، کہ بعض بڑے عابد زاہد ہوتے تھے لیکن حدیث میں معتبر نہیں، اس پر فرمایا کہ مثلاً خواجہ معین الدینؒ، قطبؒ صاحب، فرید شکر گنجؒ، سلطان جیؒ وغیرہ یہ اپنے واسطے سب کچھ سہی، لیکن وہ محدث نہ تھے، خواجہ صاحب کی کتاب ہے، توبہ توبہ اس کو دیکھ کر ہم ایسوں کو وسوسہ ہونے لگتا ہے[1]، سلطان جیؒ البتہ جانتے بوجھتے تھے، ہاں البتہ پیرانِ پیر[2] اور مجدد صاحب[3] بڑے عالم تھے، اب جاہلوں کو بزرگوں کی سند لانا حماقت ہے، وہ اپنے واسطے عابد زاہد سہی

[1] یہ بزرگوار اپنے اپنے زمانہ کے صاحب علم تھے، اس سے انکار نہیں کرنا چاہئے، البتہ ان کے ملفوظات میں ضعیف روایتیں ملتی ہیں، محدثین نے بھی زہد و قناعت اور ترغیب و ترہیب میں تساہل کر کے اسکو جائز رکھا ہے، ساتھ ہی یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ ان کتابوں کا ان بزرگوں کی تصنیف ہونا بہت کچھ محلِ نظر ہے، شاہ عبد الحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں لکھا ہے، کہ شیخ نظام الدین سلطان الاولیاءؒ نے فرمایا ہے کہ "من ہیچ کتابے نہ نبشتہ ام زیراکہ شیخ الاسلام شیخ فرید الدین و شیخ الاسلام قطب الدین و از خواجگان چشت ہیچ شخصے تصنیف نہ کردہ است" (ص ۸۰، ذکر شیخ نصیر الدینؒ محمود دہلوی) "س"

[2] حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ [3] حضرت مولینا شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی،

لیکن ان کو علم سے کیا نسبت، اس سبق کے بعد صحیح بخاری کا سبق ہوا، پھر مشکوٰۃ المصابیح کا، پھر صحیح بخاری کا، پھر جلسہ برخاست ہوا،

خواجہ باقی باللہ کا مزار

میں قیام گاہ پر واپس آیا، کھانا کھانے کے بعد قیلولہ کے واسطے لیٹ گیا، نیند آگئی اور آنکھ دیر میں کھلی، اٹھکر نماز پڑھی، اس کے بعد میں نے خیال کیا، کہ آج دیر ہوگئی ہے، جلسۂ درس میں اب جانا فضول ہے، آج چلو زیارت ہی کر آئیں، اس تہیہ سے جو میں اٹھا، تو بھائی جی بھی ساتھ ہوگئے، اجنبیت کی وجہ سے راستہ دریافت کرنے کی ہر جگہ ضرورت ہوئی، اور کہیں کہیں چکر بھی کھا گئے، تاہم لاہوری دروازہ گئے، وہاں سے فصیل پر ہوکر فراش خانہ کی کھڑکی تک برابر فصیل فصیل گئے، وہاں سے شہر کے باہر نکل کر اولاً خواجہ باقی باللہؒ صاحب کے مزار پر گئے، ان کے مزار پر فاتحہ پڑھکر خواجہ کلاں خلف الرشید خواجہ صاحب ممدوح کے مزار پر گئے، وہاں سے خواجہ خردؒ کے مزار پر آئے، جو خواجہ باقی باللہؒ صاحب کے مزار کے قریب ہی ہے، ان بزرگوں کے مزاروں پر فاتحہ پڑھکر مسجد آئے، یہ بالکل متصل ہے، ان کی مزار پر انوار کی مسجد کے ایک جانب ان کا مزار ہے، دوسری جانب اخوند شاہ عبدالعزیز صاحب کا مزار ہے، ان کے مزار پر فاتحہ پڑھکر واپس ہوئے، اس جگہ ایک شہر خموشان ہے، جدھر نگاہ جاتی ہے، مزار ہی مزار ہیں، خواجہ صاحب کے مزار سے آتے ہوئے عین راستہ پر ایک قبر ملتی ہے، اس پر لکھا ہے کہ للہ اس پر بھی فاتحہ پڑھتے جاؤ، اسکو دیکھ کر میں ٹھہر گیا، او خاصتہً اس مزار پر بھی فاتحہ پڑھا،

قدم شریف

وہاں سے نزدیک قدم شریف ہے آبادی کے اندر یہ آبادی بہت پرانی معلوم ہوتی ہے، ایک قلعہ ہے اس قلعہ کا نشان مسلمانوں کی عملداری سے پیشتر تک معلوم ہوتا ہے، بہت قدیم اور پرانا اور بوسیدہ قلعہ ہے، اس کے اندر جاکر پھر ایک کوٹ ملتا ہے، وہ قدم شریف کے نام سے موسوم ہے، اندر ایک مسجد ہے اور مسجد کے متصل صحن کے برابر بہت سی قبریں ہیں، یہ قبریں شاہزادوں

اور نواب زادوں کی ہیں، ان قبروں سے نکل کر ایک بلند مکان قبہ دار ہے، جس میں متعدد درجے ہیں، بیچ میں ایک قبہ بنا ہے، اس سب مکان کی عمارت سنگ خارا کی ہے، اس قبہ کے اندر سنگ مرمر کا فرش ہے، بیچ میں ایک تابوت جالدار رکھا ہے، اس پر ایک پتھر غالباً سنگ خارا کا ٹکڑا ہے، اوس پر قدم رسول کا نشان بتایا جاتا ہے، اس میں پانی بھرا ہے، جب بٹھایا جاتا ہے تو وہ نشان نظر آتا ہے، میں نے غور سے دیکھا، لیکن پانی کی وجہ سے مجھے نہیں نظر آیا، وہی پانی تبرکاً مجاور لوگوں کو دیتا ہے، وہ لوگ اسکو تبرکاً چہرہ پر ملتے ہیں، اور کچھ پی جاتے ہیں، مجھ سے بھی اس نے کہا، لیکن میں نے اعتنا نہیں کیا، گمان کیا جاتا ہے، کہ وہ قدم شریف حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت اپنے فرق مبارک پر رکھ کر عرب سے لائے تھے، اسوقت اسکے واسطے یہ عمارتیں بنائی گئیں، اور جب ہی سے یہاں رکھا ہے، پھاٹک پر ایک دوکان عطار کی ہے، وہ بزرگ ایک ٹوکری میں گلاب کے پھول رکھے ہوئے ہیں، جو اندر جاتا ہے یہیں سے چڑھانے کو پھول لیتا ہے،

شاہ ولی اللہ صاحب کے خاندان کے مزار

وہاں سے نکل کر پھر شہر کی طرف آئے، شہر میں فراش خانہ کی کھڑکی ہوکر داخل ہوئے، وہاں سے آتے آتے فراش خانہ کے پھاٹک تک جو شہر کے اندر بازار کی طرف ہے، وہاں ایک یکہ کرکے مہندیوں کی طرف چلے، یہاں سے یکہ پر جامع مسجد کی پشت پر ہوتے ہوئے دہلی دروازہ سے نکل کر کوٹلہ پہونچے، وہاں معلوم ہوا کہ مہندیان دوسری جانب ہے، دریافت کرکے اس طرف چلے، جیل خانہ کے پشت پر مہندیان میں یکہ کو سڑک پر چھوڑ کر پیادہ پا وہاں گئے، ایک مسجد ہے، اور مسجد کے احاطہ میں اور اس کے باہر قبرستان ہے، پہلے عصر کی نماز پڑھی، اس کے بعد مزاروں کی تفتیش کی، کوئی شخص مجاور کی قسم سے یہاں نہ تھا، جس سے معلوم ہوتا، اکثر مزاروں پر لوح نہ تھی، اور جن پر تھی وہ قریب العہد معلوم ہوتی تھی، مسجد کے داہنے جانب مزارات پرانے معلوم ہوتے تھے، ان پر گمان ہوا، کہ شاید یہ ہوں، لیکن کوئی وجہ قاطع نہ تھی، اور طبیعت بھی پیچھے کو

ہنستی تھی، میں نے دل میں خیال کیا کہ جو ارتباط مجھ سے اور ان بزرگوں سے ہے، وہ خود راہبری کرے گا، اسی فکر میں وہاں سے مایوس ہو کر لوٹا، اور سخت خلجان تھا، کہ جس واسطے آیا، وہ بات حاصل ہوئی، جیسے ہی منہ پھیرا مسجد کے بائیں طرف دو تین مزاروں پر کچھ تحریر نظر آئی، دیکھا تو شاہ عبدالرحیم اور شاہ ولی اللہ لکھا تھا، ان مزاروں پر پہنچکر فاتحہ پڑھا، ان کے پائتی شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ رفیع الدینؒ صاحب کا مزار تھا، ان دونوں پر فاتحہ پڑھا، اور شاہ عبدالعزیزؒ صاحب کا مزار پیرا تو ار جو شاہ ولی اللہؒ صاحب کے مزار کے پاس مغرب کے جانب تھا، اس پر فاتحہ پڑھا، اور سور قرآنی مثل الھاکم التکاثر وسورہ یٰسین وغیرہ کو پڑھکر ایصالِ ثواب کیا، طبیعت کو اس قدر دلبستگی ہوئی، کہ دیر تک وہاں بیٹھا رہا، اور خدا سے ان لوگوں پر رحمت نازل فرمانے اور اپنے لئے حصولِ علم وعمل کی دعا کرتا رہا، قبل مغرب وہاں سے اٹھ کر پھر شہر کی طرف روانہ ہوا، مغرب کی نماز قیام گاہ کے قریب جو مسجد ہے وہاں آکر پڑھی،

درس حدیث | روز پنجشنبہ ۱۹ ار رجب۔ آج صبح کو اٹھکر حوائجِ ضروری سے فراغت کر کے درس گاہ گیا، ترجمہ کا سبق ہو رہا تھا، اس کے بعد مقدمۂ صحیح مسلم شروع ہوا، اس کے بعد صحیح بخاری کا سبق ہوا، اثنائے سبق میں کتاب الحیض میں اس کا ذکر تھا کہ اقل مدت طہر کی امام صاحب کے نزدیک ۱۵ دن ہیں، اس پر مولوی صاحب بہت برہم ہوئے، کہا خانہ ساز بات ہے، کوئی حدیث اُن کے پاس نہیں ہے، طہر کی کوئی مدت نہیں حائضہ کی رائے پر ہے، حدیث میں کوئی تحدید نہیں ملی،

آج کل مولوی صاحب کے یہاں صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، مشکوٰۃ المصابیح، ہدایہ اور بیضاوی ہوتی ہیں، بخاری شریف چار پانچ جگہ ہوتی ہے، اور صحیح مسلم صرف دو جگہ، اور اکثر ان کے یہاں صحاح میں صحیحین اور جامع ترمذی ہوتی رہتی ہیں، ابی داؤد ابن ماجہ نسائی وغیرہ نہیں ہوتیں، میں نے دریافت کیا کہ ابی داؤد بہت مشکل کتاب ہے، یہ کیوں نہیں ہوتی، تو معلوم ہوا کہ اس کا

کوئی صحیح نسخہ نہیں ملتا، اس وجہ سے متروک ہے،

اوقات | اوقات سبق کے یہ ہیں، کہ طلوعِ آفتاب سے تقریباً گیارہ بجے تک اور دو بجے سے چار بجے تک، اس عرصہ میں ۳ بجے کے قریب عصر کی نماز بھی ہو جاتی ہے، چار بجے گھر چلے جاتے ہیں، پھر قبیل مغرب آتے ہیں، اس وقت جسکو جو پوچھنا ہوتا ہے وہ پوچھتا ہے، جسکو ملاقات کرنا ہوتا ہے، وہ ملاقات کی غرض سے آتا ہے، مغرب کے بعد گھر چلے جاتے ہیں، عشا اور صبح کی نماز گھر میں پڑھتے ہیں، کھانا دونوں وقت اپنی بیٹی کے گھر میں کھاتے ہیں، اور رات کو پوتوں کے یہاں سوتے ہیں، دو پوتے ہیں، ایک کا نام عبدالسلام ہے، دوسرے کا نام ابوالحسن، آج کل عبدالسلام مقدمہ صحیح مسلم پڑھتے ہیں، صبح کو ترجمہ کے بعد ان کا سبق ہے، اور افتاء کا کام انہی کے متعلق ہے، انھوں نے قطبی تک درسیات پڑھی ہیں، ہدایہ وغیرہ بھی پڑھا ہے، صحاح ایک مرتبہ پڑھ چکے ہیں، اور ابوالحسن کے دو سبق ہیں، ایک صحیح مسلم کا، دوسرا صحیح بخاری کا، ایک مولوی صاحب کے بھتیجے ہیں، عبدالحفیظ وہ آج کل ہدایہ اور بیضاوی پڑھتے ہیں، انھوں نے بھی درسیات میں صرف مختصرات پڑھی ہیں،

شاہ محمد عمر صاحب | حسب معمول گیارہ بجے کے قریب قیام گاہ پر میں واپس آیا، کھانا کھا کر قیلولہ کے بعد ظہر کی نماز مسجد میں پڑھی، اس کے بعد ارادہ ہوا کہ شاہ محمد عمر سے جو اخوند صاحب کے نواسہ مشہور ہیں ملاقات کرنے کو جاؤں، وہ فراش خانہ کی کھڑکی کے پاس رہتے ہیں، اور اخوند صاحب کے سجادہ نشین ہیں، وہاں گیا، تو معلوم ہوا کہ خلوت خانہ میں ہیں، یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ مولوی فریدالدین صاحب کے بیٹے اور حافظ اکرام الدین صاحب مصنف تفسیر سورۂ فاتحہ کے پوتے ہیں، اور اخوند صاحب مجرد تھے، ان کے بھائی کے نواسہ ہیں، یہ بھی مجرد ہیں، عمر چالیس کے قریب ہے، اوقات کے بہت پابند ہیں، شب کو خلوت خانہ میں آرام کرتے ہیں، دو ڈھائی بجے سے اٹھکر اذکار و اشغال میں مصروف

رہتے ہین، صبح کی نماز پڑھکر پھر حجرہ میں چلے جاتے ہین، اور ۱۰ بجے تک کنڈی بند رہتی ہے، اس کے بعد نکلتے ہیں، واردین وصادرین سے ملتے ہیں، پھر اندر چلے جاتے ہین، ظہر کی نماز کے واسطے نکلتے ہین، میں بیٹھا تھا کہ وہ اندر سے نکلکر مصلے پر کھڑے ہوگئے، میں بھی نفل کی نیت سے شریک ہوگیا، نماز کے بعد معمولاً ختم خواجگان کے واسطے بیٹھے، میں بھی شریک ہوگیا، بعد ختم کے نشست کے کمرہ مین جاکر بیٹھے، میں بھی جاکر بیٹھا معمولی تعارف مجھ سے ہوا، اثنائے گفتگو میں مجھ سے کہا، کہ آپ کہاں بیعت ہین، مین نے کہا، اپنے ہی خاندان میں اس کے بعد میرے خاندان کے سلسلہ کا حال پوچھنے لگے، مین نے سب بیان کیا، پھر مین نے کہا کہ رسالہ فخر الحسن کے دیکھنے کا مجھکو بہت شوق ہے، آپ کے یہاں ہو تو عنایت فرمائیے، کہا کہ میرے یہاں نہیں ہے، مگر میں نے دیکھا ہے، وہ عربی میں ہے، اسکی ایک شرح ہے، القول المستحسن، وہ بھی عربی میں ہے، میں نے کہا کہ خاندان نقشبندیہ کے سلسلہ میں بھی انقطاع بیان کیا جاتا ہے، کہنے لگے کہ شیخ ابو الحسن خرقانیؒ اور حضرت بایزید بسطامیؒ کا لقا ثابت نہیں ہے، میں نے کہا دوسرے طور کا اور بھی ہے یعنی حضرت قاسم[1]، اور حضرت سلمانؓ[2] کے لقا میں گفتگو ہے، کہنے لگے یہ مجھکو معلوم نہ تھا آج معلوم ہوا، پھر مجھ سے کہا کہ یہ کہاں سے معلوم ہوا، میں نے کہا کہ کتب طبقات سے کہنے لگے آپنے دیکھی ہیں، میں نے دو چار کتابوں کے نام لئے، پھر پوچھا آپ نے تحصیل کہاں کی ہے، میں نے کہا لکھنؤ میں، کہا حدیث کس سے پڑھی ہے، میں نے کہا شیخ حسین صاحب محدث یمنی سے، اور مسلسل بالاولیہ کی روایت شاہ ابو الحسین صاحب مارہروی سے بھی حاصل کی ہے، اس کے بعد پوچھتے رہے، کہ شاہ صاحب سے کہاں ملاقات ہوئی، میں نے سب حال بیان کیا، یہ بھی کہا کہ مجھکو شیخ عبد الحق صاحب محدث دہلوی سے سند حاصل کرنے کا بہت شوق تھا، اس وجہ سے زیادہ تر میں نے اون سے سند لی، پھر پوچھا کہ یہاں کیونکر آپ تشریف لائے، میں نے کہا، کہ زیارت قبور مشائخ و ملاقات اکابر وقت کے لئے، اور آپ کی خدمت میں اس لئے کہ زیارت بزرگون کی

[1] حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکرؓ، [2] حضرت سلمان فارسیؓ،

باعث کفارہ گناہ ہے، اور یہ بھی خیال ہے کہ اپنی استعداد کے موافق کچھ استفادہ کر حاصل کروں، اسکو سنکر نہایت ہی تواضع وانکسار کی راہ سے کہنے لگے، کہ حضرت میں تو آپ ہی بزرگوں کا خوشہ چین ہون، نہ پڑھا نہ لکھا، گلستاں بوستاں کچھ پڑھ لی ہے، بدنام کنندہ بزرگاں ہون، اور انہی کی جوتیاں اٹھاتا ہوں، اور اسی کو باعث نجات جانتا ہوں، میری صورت شکل دیکھ کر لوگوں کو دھوکہ ہوجاتا ہوگا، ورنہ میں کچھ بھی نہیں ہون، آپ میرے واسطے دعا کیجئے، آپ کی دعا کی برکت سے خدا میری مغفرت فرمائے، میں اس کا جواب مناسب الفاظ میں دیتا رہا، اس کے بعد رخصت ہوا، رخصت کے وقت نصف قد تعظیم کے واسطے اٹھے، میں چلا آیا،

یہ بزرگ نہایت سنجیدہ فہمیدہ خوش رو خوش پوشاک خوش خلق ہین، تکسیر ورقیت میں ان کو بہت دخل ہے، اخوند عبد العزیز صاحب کے صاحب سجادہ ہیں، وہ حضرت اچھے میاں صاحب مارہروی کے خلیفہ تھے،

کتابوں کی نایابی

انکے یہاں سے آکر عصر کی نماز پڑھی، اس کے بعد میاں صاحب[1] کی خدمت میں گیا، دیر تک صحبت رہی، مختلف قسم کی باتیں کرتے رہے، کتابون کا کچھ ذکر آیا، کہنے لگے، اب اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل کیا ہے، کہ افراط کیساتھ کتابیں ملتی ہیں، جو کتابیں خواب وخیال میں نہ تھیں، وہ اب کوڑیوں کے مول ملتی ہیں، عالمگیری عزیز الوجود تھی، گورنمنٹ نے کلکتہ میں غدر سے پہلے چھپوائی، وہ ٹوروپیہ کو ملتی تھی، تفسیر کبیر تین سو روپیہ کی، ایک نسخہ بادشاہ کے یہاں تھا، جب شاہ عبد العزیز صاحب کو ضرورت ہوتی تھی، تو بادشاہ کے یہاں سے منگواکر دیکھتے تھے، فتح الباری کو کوئی جانتا بھی نہ تھا، دہلی بھر میں صرف تین جگہ چند چند اجزا اوس کے تھے، تمام دہلی میں بخاری کے صرف اٹھارہ نسخے تھے، بعض بعض فیاض لوگوں نے بخاری کے پارہ پارہ الگ کر لئے تھے، کسی

[1] مولینا سید نذیر حسین،

طالب علم کو پہلا پارہ دیدیا، کسی کو دوسرا یوں طالب علموں کو پڑھنا میسر آتا تھا، میں جب ترمذی میاں صاحب کے یہاں پڑھتا تھا، اس وقت ترمذی کے ایک نسخہ میں ہم تین آدمی شریک تھے، اور تینوں جدا جدا رہتے تھے، ایک شہر کے اس کنارے ایک دوسرے کنارہ میں ریل کے اسٹیشن کے پاس رہتا تھا، ایک آدمی دو تین گھنٹہ لاکر مطالعہ کرتا تھا، پھر دوسرا لیجاتا تھا اسی طرح پر دن بھر وہ گشت کرتا رہتا تھا، کوئی کتاب پوری پڑھنی کسی کو نصیب نہیں ہوتی تھی، ہدایہ کے جزو جزو کرکے طلبہ پر تقسیم ہوجاتے تھے، کوئی یہاں سے پڑھ رہا ہے، کوئی وہاں سے، جب جزو ختم ہوتا تھا، تو چار سطریں رہ جاتی تھیں، بسبب فقد سیاق و بے ربط ہونے کے، اسی طور پر ہر کتاب ناقص رہتی تھی، کسی کے پاس اگر غلط نسخہ بھی پورا ہوا تو وہ نعمت کبری سمجھا جاتا تھا، اور وہ شخص بڑا دولت مند خیال کیا جاتا تھا، اسی اثناء میں استفتے پیش ہوئے، ایک فتوی اس بارے میں تھا، کہ آیا نماز عید کی عیدگاہ میں ہونی چاہیے، یا مسجد میں اس بارہ میں پٹنہ میں بڑا مناظرہ ہورہا ہے، طالب علم نے جواب پڑھکر سنایا، کہ عیدگاہ میں پڑھنا چاہیے، اگر کوئی عذر ہو تو البتہ مسجد میں ہوسکتی ہے، اس کے دلائل اس نے کئی ورق میں لکھے تھے، سب سنتے سنتے مغرب کا وقت آگیا، میں نے بھی مغرب کی نماز وہیں پڑھی، بعد نماز مغرب کے میں قیام گاہ پر واپس آیا،

مولوی محمد حسین فقیر | روز جمعہ ۱۰ رجب آج چونکہ مولوی نذیر حسین صاحب کے یہاں درس نہیں ہوتا، اس واسطے میرا قصد یہ ہے، کہ مولوی محمد حسین صاحب فقیر سے ملاقات کراؤں، اور اگر ممکن ہو تو خانقاہ شریف میں جاکر فاتحہ خوانی سے مشرف ہوں، اس ارادہ سے میں چاندنی چوک ہوتا ہوا، ان کے مکان کی تلاش میں چلا اتنا مجھکو معلوم تھا، کہ جامع مسجد کے پشت پر ٹوکری والوں میں رہتے ہیں، اس واسطے جامع مسجد کی طرف چلا، جامع مسجد کے راستہ معہود کو میں نے چھوڑ دیا، دوسری سڑک گھنٹہ گھر کے سامنے داہنے ہاتھ کو تھی، اس طرف ہولیا، تاکہ ضمناً ہر حصہ شہر کی سیر ہوجائے، بہت دور جاکر جامع مسجد کی طرف جانے کی

سڑک ملی، اس سڑک پر ہوکر جامع مسجد کی جنوبی سیڑھیوں پر پہونچا، ان سیڑھیوں کے سامنے ایک گلی ملتی ہے، اس کا نام ہے، امام کی گلی، اس کے اندر ہوکر ٹوکری والوں میں پہونچا، وہاں مولوی محمد حسین صاحب کا مکان تلاش کرکے دروازہ پر آواز دی، معلوم ہوا کہ مولوی صاحب سفر میں گئے ہیں، ایک مہینہ میں آئیں گے: ناکام واپس ہوا،

خانقاہ مجددی | اور ایک گلی میں ہوکر چتلی قبر کو پوچھتا ہوا آگے بڑھا، چتلی قبر میں دو راستے ہیں، ایک راستہ داہنے ہاتھ کو ہے، وہ سیدھا خانقاہ شریف کو گیا ہے، جب خانقاہ کے دروازہ پر پہنچا تو پھاٹک بند تھا، معلوم ہوا، کہ یہ پھاٹک کبھی نہیں کھلتا، دو برس سے صاحبزادہ[1] صاحب کسی سے نہیں ملتے، امراء، غرباء، علما، فقراء، مریدین مخلصین، واردین صادرین کسی سے ملاقات نہیں کرتے، آگے جمعہ اور عیدین کی نماز کے واسطے عام اجازت تھی، اب وہ بھی بند کردی گئی ہے، دو چار خادم ولایتی[2] ہیں، ان کو کسی وقت حضوری نصیب ہوتی ہے، ورنہ وہ بھی محروم ہیں، غیر تو کیا ان خادموں کی بھی مجال نہیں، کہ بے اجازت پھاٹک کے اندر قدم رکھیں، سقا، دھوبی، بھنگی، کوئی نہیں جانے پاتا، کوئی ماما بھی صاحبزادہ صاحب کے یہاں ملازم نہیں ہے، ایک خود ہیں، اور ایک ان کی بیوی صاحب، ایک ولایتی اپنے ہاتھ سے پانی بھر لاتا ہے، وہی پیتے ہیں، جب کبھی علیل ہوتے ہیں، تو صرف حکیم عبد المجید خانصاحب کو اجازت ہوتی ہے، وہ جاتے ہیں، ورنہ شہر کے لوگوں میں سے بھی کوئی شخص نہیں جانے پاتا، خادم صرف خانقاہ کی ڈیوڑھی تک جانے پاتے ہیں، خطوط جو چٹھی رساں لاتا ہے، اس کے واسطے یہ قاعدہ ہے، کہ پھاٹک کے بائیں جانب ایک کھڑکی ہے، اس میں کٹہرہ لگا ہے، اس کے اندر ایک لیٹر بکس کے طور پر بکس رکھا ہے، اس میں قفل لگا ہے، اس کے اندر چٹھی رساں خط ڈالدیتا ہے، جب حکم ہوتا ہے تو

---

[1] حضرت مجدد الف ثانی کے خاندان کا ایک حصہ دہلی اکبرآباد ہوگیا تھا، جس میں شاہ عبد الغنی مجددی غدر کے بعد ہجرت کرکے حجاز چلے گئے تھے، صاحبزادہ سے مقصود شاہ ابو الخیر صاحب ہیں، [2] ولایتی سے مقصود افغانی ہیں

ایک خاص خادم ان خطوں کو نکال کر حضور میں لیجاتا ہے، یا جس کا جی چاہے، کچھ لکھ کر ڈال دے، وہ پہونچ جاتا ہے، اور جواب بھی ملجاتا ہے، مگر اس کے واسطے کوئی خاص دن مقرر نہیں ہے، جب ان کا جی چاہتا ہے، اسدن حکم ہو جاتا ہے، ایک ولایتی خادم پھاٹک کے باہر ایک پھوس کے دالان میں رہتا ہے، اس کے معرفت جواب ملجاتا ہے، گویا وہ قلعدار ہے، میں نے یہ حالت دیکھ کر ایک خط پنسل سے وہیں لکھ کر اس کے اندر ڈالدیا ہے، جس کا مضمون یہ ہے، کہ میں عرصہ سے آستانہ بوسی کا مشتاق تھا، اب اسکی توفیق پائی ہی امید ہی کہ محروم واپس نہ کیا جاؤں، اپنا نام اور پتہ اس پر صاف صاف لکھدیا ہے، اس ولایتی خادم نے کہا، کہ جب ڈاک کھولی جائے گی، اس وقت جیسا جواب ملے گا، میں تم سے کہدوں گا، کسی روز پھر آجانا،

جامع مسجد میں نماز جمعہ

اس کارروائی کے بعد میں واپس آیا، آتے ہی کھانا کھا کر نماز جمعہ کے واسطے جامع مسجد گیا، یہ عجیب و غریب مسجد ہی جس کی تعریف و توصیف کرنا غیر ممکن ہے، اس سال بجلی کے گرنے سے ایک مینار ایک گنبد اور مشرقی دروازہ پر صدمہ پہنچا ہی، اسکی مرمت ہو رہی ہی، رئیس بھاولپور اس کے مصارف کے متکفل ہوئے ہیں، اس مسجد کے شمالی غلام گردش میں مشرقی گوشہ پر ایک نہایت آراستہ دالان میں بہت بڑی ضریح رکھی ہے، یہ ضریح بہت ہی مکلف ہے، اس کے اندر قدم شریف رسول صلعم کا نشان بتایا جاتا ہے، جمعہ کی نماز میں اس مسجد کی وسعت کے موافق لوگ نہ تھے، تاہم بہت بڑی جماعت تھی،

شاہجہان بادشاہ مرحوم نے جس کو امامت کے واسطے عرب سے بلایا تھا، انہی کی اولاد میں یہ خدمت چلی جاتی ہے، یہ بزرگ قوم کے سید ہیں، ایک نقرئی عصا لیکر خطبہ پڑھتے ہیں، اس عصا کے اوپر طلائی تکیہ ہے، متعدد دیکھرہیں، بعد نماز کے تین جگہ وعظ ہوا، کبھی کبھی اس سے زیادہ وعظ ہوتے ہیں، ایک صاحب منبر پر بیٹھکر کہتے ہیں، دوسرے میذنہ کے قریب تیسرے حوض پر لوگوں کا ہجوم بھی بہت ہوتا ہے،

مسجد کے باہر مزارات

مسجد کے مشرقی دروازہ کے قریب سرمدؒ کا مزار ہی، اسی کے پاس ہرے بھرے کا ادر

تھوڑے فاصلہ پر قلعہ کے جانب حضرت شیخ کلیم اللہؒ جہان آبادی کا مزار ہے، مزار کے گرد کٹہرہ بنا ہوا ہے، یہ بزرگ بڑے عارف کامل تھے،

لال قلعہ

آج پیشتر سے ہم نے قلعہ کی سیر کا ارادہ کر لیا تھا، اسواسطے کا لیخاں کو قبل نماز کے کہدیا تھا کہ ٹکٹ لے رکھنا، جب ہم نماز سے فارغ ہوے تو انھوں نے ٹکٹ پیش کیا، یہ ٹکٹ چار آدمیوں کے واسطے کافی تھا، ڈھائی آنے اس کے حصول میں صرف ہوے، مسجد سے براہ راست قلعہ گئے، یہ قلعہ بالکل سنگ سرخ کا بنا ہوا ہی اپنی لطافت اور سبکی میں بے نظیر ہے، دروازہ پر ایک گورہ ٹہل رہا تھا، اس نے ٹکٹ لے لیا اور ہم اندر روانہ ہوئے، قلعہ کے اندر جانے کے بعد متعدد دروازے اور ڈیوڑھیاں مسلسل ملتی ہیں، ان میں ان میں اب آجکل گورہ بازار ہی، اس سے نکل کر پھر بالکل ویران اور غیر آباد ہے، کہیں کہیں انگریزی عمارتیں اور بارکین بنی ہوئی ہیں، شاہی عمارتیں بالکل متاصل کر دی گئی ہیں، ان کے نشانات اب صرف دربار عام کے ایک درجہ سے اور دربار خاص و حمام و مسجد و مثمن برج سے معلوم ہوتے ہیں، جنکے دیکھنے سے ایسی عبرت و رقت ہوتی ہے، جو کسی طرح بیان میں نہیں آسکتی، سبحان اللہ یہ وہ مکانات ہیں جنہیں ہر کس و ناکس کے پہونچنے کی مجال نہ تھی، بڑے بڑے امرا ہفت ہزاری و پنجہزاری دربار عام تک پہونچنے کو فخر و سعادت سمجھتے تھے، وہی تخت جس کے سامنے دربار اکبری و جہانگیری میں سجدہ کرتے تھے، اور دربار شاہجہانی و عالمگیری میں اوس کے پایہ کے بوسہ دینے کو فخر سمجھتے تھے، آج ادنی ادنی گورہ جوتہ پہنے ہوئے، اس کو روندتا ہے، فاعتبروا یا اولی الابصار

الملك لله والامر لله والارض لله يورثها من يشاء

آن شاہ کہ خویش را ہلاکو می گفت — وز کبر و منی سخن بہ ابرو می گفت
بر کنگرۂ سرای او فاختۂ — امروز نشستہ بود و کو کو می گفت

ناظرین مجھ کو معاف کیجئے گا، ان مکانوں کے دیکھنے سے میرا دل ایسا بے قابو ہے کہ میں

ان کے حالات بیان کرنے سے بھی قاصر ہوں، بلکہ جو شخص ان درباروں کی ہسٹری اور قلعہ کی جاگرفی سوما
ہے وہ کیا ممکن ہے کہ ان کو دیکھ کر آٹھ آٹھ آنسو نہ روئے اس کا دل بے چین نہ ہو جائے اسکے بدن پر رونگٹے
نہ کھڑے ہو جاویں، اسکی آنکھوں کے سامنے خدا کی سچی عظمت و ہیبت نمودار نہ ہو جائے، دنیا کے فانی ہو
کا طلسمی پردہ نہ اٹھ جائے، ذرا تھوڑی دیر کے واسطے آپ حدیقۃ الاقالیم میں محمد شاہی دربار کا سماں د
لیجئے، پھر عالم شاہی دربار کا تنزل ملاحظہ فرمائیے، پھر ان ٹوٹی پھوٹی دیواروں میں کر و فر تہذیب
کے آثار دیکھئے، اللہ اللہ ولا موجود الا اللہ،

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ آثار پدید است صنادید عجم را

اب نہ وہ زمانہ ہے نہ وہ لوگ ہیں، نہ بادشاہ ہیں، نہ ان کے درباری یہ ٹوٹی پھوٹی عمارتیں
باقی ہیں، جو زبان حال سے مسلمانوں کے اقبال و ادبار ترقی و تنزل کا بیان کر رہی ہیں، بڑا سنگدل
ہے وہ شخص جوان کو دیکھ کر نہ رو اٹھے، بڑا قاسی القلب ہے وہ مرد جوان کو دیکھ کر متاثر نہ ہو، بڑا بے حمیت
ہے وہ مسلمان جو مسلمانوں کے اقبال و ادبار کی ان حقیقی تصویروں کو دیکھ کر خاموش رہے، بڑا ڈی غیرت
ہے وہ نیچری جو کارخانہ قدرت کی ان نیرنگیوں کو دیکھکر اپنے عقیدہ پر نادم نہ ہو،

خلیلی هل هاتان دارة جلجل ودارة سلمی فی تقاف عقنقل

کیا یہ وہی دربار خاص ہے جسمیں بڑے بڑے سلاطین ہند علی قدر مراتب کھڑے ہونیکو فخر سمجھتے
تھے، کیا یہ وہی تخت ہے جس کے سامنے بڑے بڑے مہاراجہ سر جھکانے کو اپنا دین و ایمان جانتے
تھے، یہ سب کارخانہ قدرت کی نیرنگیاں ہیں، فانی ہے، اور زائل تمام کائنات اور باقی ہے وہ
ذات جس کے قبضہ قدرت میں تمام عالم کی موت و حیات ہے، جس کی قدرت اور بقا پر عالم کے نشیب
و فراز گرم و سرد، تلخ و شیریں تغیرات و حوادث بآواز بلند گواہی دے رہے ہیں، کل شیئ ہالک الا وجہہ

ہر کجا بینیم درین عبرت سرائے ہر مردن زندگانی می کند (نظامی)

میں ان باقی ماندہ عمارتوں کی بعینہ حالت کیا دکھا سکتا ہوں، اسکی واقعی کیفیت بھی کیا بیان کر سکتا ہوں
البتہ یہ بتانا چاہتا ہوں، کہ اب کیا کیا عمارتیں باقی ہیں، گویا بقول شاعر

آمادہ گشتہ ام دگر اینک نظارہ را پیوند کردہ ام جگر پارہ پارہ را

ہرچند کہ جو جو عمارتوں کے بقیۃ النہب درجے باقی ہیں، ان سے یہ بھی پتہ نہیں چل سکتا، کہ
پوری پوری عمارتوں کا گذشتہ زمانہ میں کیا انداز تھا، تاہم بفحوائے البعرۃ تدل علی البعیر
ونقش القدم علی المسیر پرانی عظمت و جلال کا نمونہ دکھاتی ہیں، ان مسلسل ڈیوڑھیوں سے نکل کر
ایک پرتاب تیر کے فاصلہ پر پھر ایک ڈیوڑھی ملتی ہے، لیکن صرف ڈیوڑھی ہی ڈیوڑھی ہے چاردیواری
قائم نہیں ہے، نہ یہ معلوم ہوتا ہے، کہ کسی مکان کی ڈیوڑھی ہے، لیکن گمان غالب یہ ہے کہ شاہی محلات
کی ڈیوڑھی ہے، کیونکہ اس کے محاذی کچھ دور پر دربار عام کا ایک درجہ ملتا ہے، یہ سنگ سرخ کی
عمارت ہے، بہت بڑے بڑے دالان اور بہت مضبوط کھمبوں پر قائم ہیں، غالباً یہ وہی ستون ہیں
جن کے پاس ہر ہر راجہ اور امیر علی قدر مراتب کھڑا ہوتا تھا، کنارے پر تخت ہے سنگ مرمر کا،
اس پر سنگ موسی اور عقیق و نیلم کے نقش و نگار متعلق بدیدہ ہیں نشنیدہ، اس تخت کے گرد لوہے کا
کٹہرہ ہے، شاید حفاظت کی غرض سے اب بنا دیا گیا ہے، اس سے آگے بڑھکر کچھ دور جا کر
ان عمارتوں کے نشان ملتے ہیں، جن کا نظیر چار دانگ عالم میں نہیں بتایا جاتا، یعنی دربار خاص
مثمن برج و حمام، وہاں جا کر عقل دنگ ہو جاتی ہے، اور جگمگاہٹ سے آنکھوں کو چکاچوند ہونے
لگتی ہے، اے اللہ اے صانع کائنات یہ انسانی کاریگری کا نمونہ ہے، یا بہشت بریں کا
ٹکڑا، اگر بہشت بریں کا ٹکڑا ہے تو اس کے رہنے والے کون ہیں، کیا جنت میں جانے کے بعد نکال
بھی دیئے جاتے ہیں، وہ کہاں گئے، یہ کیوں غیر آباد ہے، پھر ان کے ساتھ اتنا نشان بھی کیوں
باقی رکھا گیا، کیا ہم لوگوں کے رونے کے واسطے، عبرت کے واسطے، اے کاش اب بھی عبرت

حاصل کریں، بڑے خوف سے دن کو جواس میں رہتے تھے، اور پانچ وقت خدا کے سامنے سجدہ کرتے تھے، تف ہو فرعون پر جس نے صرف مصر کی ان گڑھے جوڑ عمارتوں پر خدائی کا دعویٰ کیا، آفرین ہے شاہجہان پر، جس نے تخت طاؤس چار کرور روپیہ صرف کر کے بنایا، اور اس پر بیٹھتے ہی خدا کے سامنے نہایت عاجزی و فروتنی کی راہ سے سر جھکا دیا یعنی دو رکعت نماز ادا کی، یہ ہے

تواضع ز گردن فرازان نکواست گدا گر تواضع کند خوئے اوست

اے ناظرین! عبرت! عبرت!! عبرت!!! کلُّ شئیٍ ھالکٌ الا وجھہ یہ عمارتیں بالکل سنگ مرمر کی ہیں، چھت اور ستونوں پر بالکل سونے کے نقش و نگار ہیں، جن پر نگاہ نہیں ٹھہرتی، آنکھوں کے سامنے چکاچوند آجاتی ہے، معلوم ہوتا ہے، کہ کاریگروں نے اس وقت اسکی تعمیر سے فرصت پائی ہے، فرش پر مختلف قسموں کے پتھروں کی میناکاری قابلِ دید ہے نہ شنید، وہ لطافت، وہ پاکیزگی، وہ باریکی، وہ سادگی ہے جو کسی طرح بیان نہیں کیجا سکتی، دربار خاص میں کنارہ پر سنگ مرمر کی ایک چوکی ہے، غالباً اسی پر تخت طاؤس رہتا ہوگا، اب خالی پڑی ہے، نہ تخت طاؤسی ہے نہ تخت نشین، نہ وہ مکان ہے نہ مکین، عبرت کے واسطے ایک ٹکڑا اس کا باقی چھوڑ دیا گیا ہے، جس کو دیکھ کر سیاحان گیتی نورد کے ہوش اڑتے ہیں، ایھا الناس اعتبروا یا القیاس، کہاں ہیں شاہجہان اور عالمگیر، کدھر ہیں اکبر اور جہانگیر، کہاں ہیں وہ ہفت ہزاری امرا، کدھر ہیں مشائخ اور علما، کہاں ہیں وہ چاؤشوں کی آوازیں، کدھر ہیں نقیبوں کی صدائیں، کہاں ہیں وہ نگاہ روبرو رکھنے والے، کدھر ہیں وہ نظر بر قدم رکھنے والے، کہاں ہیں وہ شعرا کی قصیدہ خوانی، کدھر ہے وہ امرا کی لن ترانی، کہاں ہے وہ لال پردہ، کدھر ہے وہ نقرئی طلائی کٹہرہ، سچ یہ ہے، کہ جو کچھ ان لوگوں نے دیکھا، وہ خواب تھا، جو ہم سنتے ہیں، وہ افسانہ ہے، بقول خواجہ میر درد،

وائے نادانی کہ بعد از مرگ یہ ثابت ہوا خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا (باقی)

مغالطۂ تحلیل

از

جناب خواجہ عبد الحمید صاحب لکچرار فلسفہ، گورنمنٹ کالج، گجرات پنجاب

کسی مخلوط وجود مثلاً کسی مشین کے سمجھنے کے لئے ہمیں سب سے پہلے اسکی تحلیل[1] کرنی چاہئے یعنی اُس مخلوط وجود (یا مشین) کا اس کے اجزاے مرکبہ میں تجزیہ کرنا چاہئے تحلیل یا تجزیہ اس اصول پر مبنی ہے، کہ وجود مخلوط کے اجزا کی ساخت اور کیفیت فرداً فرداً بہ نسبت خود اس مخلوط وجود کی ساخت اور کیفیت کے جو ان اجزا سے بنا ہے، زیادہ آسانی سے سمجھ لیجا سکتی ہے، ہر جزو کی ایک خاص ساخت اور ایک خاص "ماموریت" (یعنی کوئی ایسا کام جو اسکے ساتھ مخصوص ہوتا ہے) ہوتی ہے، جب مختلف اجزا ایک مخلوط وجود کی صورت میں جمع ہوتے ہیں، تو ان کی مختلف ماموریتیں (یعنی ان کے مختلف کام جو ہر ایک جزو کے ساتھ فرداً فرداً خاص ہیں) ایک خاص مخلوط شکل پا جاتی ہیں، اور اس خاص مخلوط شکل میں ان اجزا کی ماموریتیں ضم ہو جاتی ہیں، اور اکثر ایسا ہوتا ہے، کہ ان ماموریتوں کی کیفیتیں، اور ان کے کارہاے مخصوص، بالکل نئی نوعیت اختیار کر لیتے ہیں، چنانچہ وجود مخلوط کی مجموعی ماموریت، بسا اوقات اپنے اجزاے مرکبہ کی ماموریتوں سے مختلف اور زیادہ پیچیدہ ہوتی ہے، مثلاً ہائیڈروجن گیس سب سے زیادہ ہلکی گیس ہے، اور آتشگیر ہے، آکسیجن گیس کافی بوجھل ہوتی ہے، آتشگیر نہیں ہے، لیکن آتشگیری کی موید ہے، اور حیات کی حامی ہے، لیکن پانی جو وجود مخلوط ہے، اور ان دو گیسوں سے مرکب ہے،

[1] تحلیل اور تجزیہ کو میں نے اس مقالہ میں مترادف سمجھا ہے،

وہ نہ تو خود گیس ہے نہ آتشگیر، اور نہ آتشگیری کا موید ہے، البتہ حیات کا وہ حامی ہے لیکن آکسیجن سے بالکل مختلف طریقہ پر،

اس سے ظاہر ہوا کہ اگر ہم بعض منفرد اجزار کی خاصیتیں، کیفیتیں، اور کارہائے مخصوص، اچھی طرح سے سمجھ لیں، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا، کہ ہم نے اس مخلوط وجود کی مجموعی خاصیت، کیفیت اور کارِ مخصوص کو بھی سمجھ لیا ہے، جو ان منفرد اجزار کی جمعیت یا ترکیب سے بنا ہو،

۲- مغالطۂ تحلیل - سے مراد یہ دعویٰ ہے، کہ اگر ہم کسی وجودِ مخلوط کے اجزائے مرکبہ کی خاصیتیں، کیفیتیں اور کارہائے مخصوص کلی طور پر سمجھ لیں، تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں، کہ ہم نے خود اس وجودِ مخلوط کی خاصیت، کیفیت اور کارِ مخصوص کو سمجھ لیا ہے،

مندرجۂ بالا سطور (یعنی فصل نمبر۱ میں) اس مغالطہ کی نوعیت سرسری طور پر ظاہر ہو چکی ہے آئندہ سطور میں ان امور پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی،

۱- مغالطۂ تحلیل کو مغالطہ کیوں کہا گیا ہے،

۲- کیا تحلیل ہر حالت میں مغالطہ ہے،؟

۳- اگر نہیں تو کہاں کہاں تحلیل مفید اور ضروری ہوتی ہے،؟

۴- اور وہ کون مقام ہے، جس سے اگر تحلیل آگے نکل جائے، تو مضر ہو گی، اور مغالطہ بنے گی

۲- تحلیل سے مراد ہے، وجودِ مخلوط کا اس کے اجزا میں تجزیہ کرنا، یہ اجزا حتی الوسع منفرد ہوں یعنی علم وقت کے مطابق ان اجزا کا مزید تجزیہ ممکن نہ ہو،

وجودِ مخلوط کے سمجھنے کے لئے تحلیل مفید ہوتی ہے، کیونکہ اکثر اوقات اجزار کا سمجھنا[۱] وجودِ مخلوط

---

[۱] اس فقرے میں ہم وجودِ مخلوط کی علمی اور نظری حیثیت کی طرف نہیں بلکہ صرف اسکی عملی حیثیت کی طرف اشارہ کیا کر رہے ہیں، مثلاً آجکل منفرد اجزار کا سمجھنا جدید سائنس کے دقیق ترین نظریوں کے بغیر ممکن نہیں ہے، لیکن عملی

کے سمجھنے سے آسان تر ہوتا ہو، اگر ہم اجزا پر قابو پا جائیں، تو ان سے مرکب وجودِ مخلوط پر قابو پا جانا بھی ممکن اور آسان ہو جاتا ہے، اگر عمارت کے وہ اجزار ہمارے پاس موجود ہیں جن سے اس عمارت کی ترکیب ممکن ہے، تو عمارت کی واغ بیل عملی طور پر ڈالی جا سکتی ہے، علوم کونیہ[۱] میں تحلیل وہی کام دیتی ہے، جو عملی سیاست میں "آپس میں پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کا اصول کام دیتا ہے، جو مخلوط چونکہ مخلوط ہے، اسلئے اس میں اس کے اجزار سے کم از کم ایک پیچیدگی، تو ضرور زیادہ ہو گی یعنی اس کا مخلوط ہونا، لیکن اب سوال یہ ہے کہ

کیا تحلیل بذاتِ خود اس وجودِ مخلوط کے صحیح اور مکمل فہم و ادراک کے لئے کافی ہے،؟

اگر ہم موٹر کار یا طیارے کا چھوٹا سا نمونہ لیں، اور اسکی تحلیل اس کے اجزا میں کریں (یعنی ان میکانیتی[۲] ٹکڑوں میں کریں، جن سے وہ نمونہ بنا ہے) تو پھر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اس نمونہ کی ساخت کو اور اس کے طریقِ کار کو کسی حد تک سمجھ لیا ہے لیکن ابھی ہمیں اس نمونہ یا مشین کا مکمل ادراک یا فہم نصیب نہیں ہوا، وجہ یہ ہے کہ مکمل فہم کے لئے صرف تحلیل ہی کافی نہیں، ترکیب اور اصول ترکیب کا سمجھ لینا بھی اسکے لئے اشد ضروری ہے،

تحلیل کا کام صرف یہ ہے کہ وجودِ مخلوط کا اس کے اجزا میں تجزیہ کر دے، تاکہ اس وجود کے مکمل ادراک و فہم کے لئے راستہ کھلے، اور اس کام کے لئے پہلی اور نہایت ضروری منزل طے ہو جائے لیکن جب تحلیل اس فرض کی ادائگی سے ذرا آگے بڑھتی ہے، اور اپنی اہمیت کو اس سے زیادہ بڑھاتی ہے، تو وہ بجائے مفید ہونے کے مضر ہو جاتی ہے، اور مغالطہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے،

(بقیہ حاشیہ ص ۳۲) حیثیت سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں، کہ اگر ایک مشین دس پرزوں سے بنی ہے، تو ان پرزوں کا ادراک اس مشین کے ادراک سے آسان تر ہے،

[۱] Cosmic Sciences

[۲] Mechanical

چنانچہ یہ مغالطہ اپنی وسعت، ہمہ گیری اور آسانی کے باعث سائنس اور فلسفہ میں بے شمار غلطیوں کا محرک اور علت بن چکا ہے،

مثلاً غور کیجئے، کیا موٹر کار یا طیارے کے نمونے کے تجزیہ سے ہم نے اس نمونہ کی ساخت کو اور اس کے طریق کار کو مکمل طور پر سمجھ لیا ہے، جب ہمارے ہاتھ میں اس نمونے کے اجزا رہ گئے ہیں، تو کیا خود نمونہ ہمارے ہاتھ میں ہوتا ہے، ؟ کیا موٹر کار کے ٹکڑے موٹر کار ہوتے ہیں، ہرگز نہیں، جب تک ہم ان تحلیل شدہ اجزار کو (یعنی ان ٹکڑوں کو) اس وجود مخلوط کی صورت اور ترکیب نہ دیں یعنی جس کی تحلیل کے بعد یہ ٹکڑے ہمارے ہاتھ آئے تھے، اس وقت تک ہم یہ کہنے کے حقدار نہیں ہیں، کہ ہم نے اس نمونہ کو یا اس مشین کو یا اس وجود مخلوط کو صحیح اور مکمل طور پر سمجھ لیا ہے موٹر کار یا طیارے کی مشین کو صرف وہ شخص سمجھتا ہے، جو اس کی تحلیل بھی کرلے، اور پھر اس کے اجزاء کو صحیح طریقہ پر جوڑ کر دوبارہ وہی موٹر کار، اور وہی طیارہ بنا بھی لے، روزمرہ کے علم وعمل کے لئے صحیح فہم وادراک کا یہی طریقہ ہے، مکمل عرفان کے لئے البتہ یہ کافی نہیں، اس کے لئے ہمیں اپنے زمانہ کے علم کے مطابق ان نظری اصولوں کے فہم کی ضرورت بھی ہے جو اصول اس وجود مخلوط اور اسکے اجزاے مرکبہ میں کارفرما ہیں،

۴- کسی وجود یا حادثہ کے صحیح اور مکمل فہم وادراک کے لئے (خواہ وہ وجود یا حادثہ مخلوط ہے یا منفرد) یہ دو عمل ناگزیر ہیں، جامع تحلیل (یعنی اس درجہ تک تحلیل کہ اس سے آگے بڑھنا ممکن نہ ہو) اور مکمل ترکیب (یعنی وہ ترکیب جس کے مطابق اگر اجزاے مرکبہ کو جمع کیا جائے، تو وہی وجود یا حادثہ ہاتھ آئے، جس کی تحلیل سے وہ اجزار ملے تھے) ان دو عملوں میں ترکیب کا عمل زیادہ ضروری اور زیادہ مشکل ہے،

عمل ترکیب زیادہ ضروری اسلئے ہے، کہ (۱) نہ صرف اس کے بغیر فہم نامکمل رہتا ہے بلکہ اسلئے بھی کہ (۲) اس کے بغیر عمل تحلیل بسا اوقات گمراہ کن اور پر از مغالطہ ہوتا ہے، عمل ترکیب مشکل اسلئے ہوتا ہے کہ تخریب تعمیر سے توڑنا جوڑنے سے اور گم کرنا حاصل کرنے سے آسان تر ہوتا ہے،

۵- اب ذرا غور فرمائیے کہ تحلیل خالص (یا تحلیل محض) یعنی وہ تحلیل جس کے ساتھ ترکیب کا کوئی عنصر شامل نہیں ہے، کس قدر مضر ہوتی ہے، ! علم کے ہر شعبہ میں اس کے فساد آمیز تاثرات پائے جاتے ہیں،

مثلاً شعور کے متعلق اکثر اوقات نفسی یہ کہتے ہیں کہ شعور مجموعہ ہے اُن تمام نفسی یا ذہنی حالتوں کا "جو بیداری کے عالم میں ہم پر وارد ہوں، مثلاً خیالات، جذبات، حرکات، عمل، خواہشات محسوسات وغیرہ، اگر ہمارے یہ جذبات، خیالات، حرکات، خواہشات وغیرہ موجود نہیں ہیں، تو ظاہر ہے کہ ہمارا "شعور" موجود نہیں ہے، کیونکہ شعور مجموعہ ہے اُن ذہنی حالتوں اور عملوں کا، ایک تمثیل کے ذریعہ "شعور" اور شعوری حالتوں کا تعلق ذہن نشین کیا جاتا ہے، فرض کرو ہمارے سامنے ایک میز ہے، یہ میز کیا چیز ہے، ؟ جواب ملتا ہے کہ یہ میز مجموعہ ہے چار پایون اور ایک تختہ کا، اگر ان چار پایون کو اور اس تختہ کو ہم گم کردین تو کیا میز باقی رہے گا، ہرگز نہیں، اسی طرح سے ہم کہہ سکتے ہین، کہ اگر ہم اُن تمام ذہنی حالتوں اور عملوں کو جن سے شعور مرکب ہے، یا جو مل کر شعور بنتے ہیں، گم کردیں، یا اپنے شعور مین سے کسی طریقہ سے خارج کردیں، تو شعور باقی نہ رہے گا، وغیرہ وغیرہ،

ہم یہ بات ہرگز کہہ نہیں سکتے کہ امریکہ کے جس مشہور نفسی سے شعور کا یہ بیان ماخوذ ہے اس کا مافی الضمیر درحقیقت یہ تھا کہ میز محض ایک نتیجہ ہے چار پایوں اور ایک تختہ کا، یا شعور محض ایک نفسی نتیجہ ہے ہمارے محسوسات، جذبات خواہشات، حرکات وغیرہ کا، لیکن ایسے طرز استدلال اور اس تمثیل سے مخاطب کا خیال اسی طرف جاتا ہے کہ میز اور شعور کا یہ تمثیلی موازنہ اس مصنف کے تخیل میں

کسی ایسی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے، جسے وہ حقیقت سمجھتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ وہ نفسی، اور اس مذہب کے تمام دوسرے نفسی بھی خود اپنے عمل تحلیل کے شکار ہوتے ہیں،

علامتی طریقے سے اگر ہم ان کے اس استدلال کو بیان کریں، تو یوں ہوگا،

فرض کرو "ا" ایک وجود ہے، جب ہم اس کی تحلیل کرتے ہیں، تو ہمارے ہاتھ دو خاصیتیں آتی ہیں یعنی ج اور د، اس تحلیل سے مراد یہ ہے کہ اگر ہم اس وجود میں سے کسی طرح سے ج اور د کو خارج کردیں تو "ا" باقی نہ رہے گا، بالکل معدوم ہوجائیگا، اس سے یہ ثابت ہوا کہ "ا" برابر ہے ج جمع د کے یعنی (ا = ج + د)

اب اس استدلال میں تحلیل نے اپنا فرض ادا کردیا ہے، کہ اگر ہم ج اور د کو ا سے خارج کردیں، تو پھر ا باقی نہ رہے گا، لیکن اس عمل تحلیل کی صحت کے باوجود بھی یہ فارمولا (قاعدہ مختصر) کہ ا = ج + د بالکل غلط ہے، یہ صحیح ہے کہ اگر ہم میز میں سے پایے اور تختہ خارج کردیں، تو کوئی میز باقی نہ رہے گا، لیکن پھر بھی ہمیں یہ کہنے کا حق نہیں ہے، کہ میز مجموعہ ہے چار پایوں اور ایک تختہ کا، بات یہ ہے کہ مجموعے کئی طرح کے ہوسکتے ہیں، مثلاً ایک طرح کا مجموعہ ہمیں صرف پایوں اور تختہ کا نتیجہ دیتا ہے، دوسری طرح کا مجموعہ ہمارے ہاتھ میں میز دیتا ہے، پس یہ دونوں مجموعے، اور تحلیل دونوں حالتوں میں صحیح ہیں، اس سے ظاہر ہوا کہ محض تحلیل کافی نہیں، اب عمل ترکیب کو شامل کیجئے تو صحیح فارمولا یہ بنے گا کہ

ا (میز) مجموعہ ہے ج (پایوں) اور د (تختہ) کا بشرطیکہ ج اور د اس طرح جمع ہوں کہ ان کے ملنے سے ہمارے ہاتھ میں ا (میز) اور صرف ا آئے، یعنی ا = ج + د + ا ج د

اس فارمولے میں ا ج د سے مراد ج اور د کا وہ اتصال یا اجتماع ہے، جس کا نتیجہ ا اور صرف ا ہو، ظاہر ہے کہ یہ ٹکڑا ا ج د اس فارمولے کی روح رواں ہے، جب یہ ٹکڑا شامل ہے، تو فارمولا

صحیح ہے، ورنہ بالکل غلط، خیر فارمولا تو ہمارا صحیح ہوگیا لیکن کس قیمت کی ادائگی کے بعد؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم مغالطہ "انحصار مقدمہ[۱] بر نتیجہ" کے بہت قریب پہنچ گئے ہیں، اگرچہ خیریت گذری کہ اس مغالطہ میں ہم گرے نہیں، ہماری مراد یہ ہے کہ اگر ج اور د، ا کے خواص صرف اُس حالت میں اور محض اس وجہ سے ہیں، کہ اُن کے اتصال سے ہمیں ا ہاتھ آتا ہے، تو پھر ا کی تحلیل ج اور د میں نہ تو بہت زیادہ حد تک مفید ہے، اور نہ اس تحلیل ہی نے ہم پر ا کی پوری حقیقت واضح کی ہے،

متذکرہ بالا بحث سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں، کہ جامع اور مکمل تحلیل بھی ہمیں صرف حق کی طرف لیجاتی ہے لیکن خود حق نہیں ہے،

۵- ہم نے اوپر دیکھ لیا ہے کہ میکانیتی[۲] وجود مثلاً موٹر کار، طیارہ، مشین، میز وغیرہ کا صحیح ادراک و فہم ناممکن ہے، جب تک کہ تحلیل کیساتھ صحیح ترکیب شامل نہ ہو، اب سوال یہ ہے کہ ذی حیات وجود (یعنی جسم آلی یا موجود حیہ) کے صحیح ادراک کے لئے عمل تحلیل کس حد تک مفید اور کارآمد ہے، اگر سفیدہ سلول[۳] (یعنی مادہ ذی حیات) کو اس کے کیمیاوی اجزا میں تحلیل کیا جائے،

---

۱ صحیح استدلال میں نتیجہ، نتیجہ ہوتا ہے مقدمات کا یعنی اگر مقدمات تسلیم نہ کئے جائیں، تو نتیجہ بھی تسلیم نہ ہوگا، غلط ہوگا، اگر ہم صحیح استدلال کے برعکس خود مقدمہ یا مقدمات کو نتیجہ کی مدد سے حاصل کریں، تو یہ مغالطہ انحصار مقدمہ بر نتیجہ ہوگا، مثلاً ہم ثابت کرنا چاہتے ہیں، کہ بعض انسان عقلمند ہیں، اگر ہم بغیر کسی حجت یا دلیل کے پہلے ہی تسلیم کرلیں، کہ تمام انسان عقلمند ہیں، اور پھر کہیں، کہ اس وجہ سے بعض انسان عقلمند ہیں، صحیح نتیجہ ہے، تو یہ مغالطہ ہوگا، کیونکہ جو کچھ ہم کو ثابت کرنا تھا، اسے ہم نے بغیر حجت کے پہلے ہی ایک عام شکل میں تسلیم کرلیا ہو۔ ۲ میکانیتی وجود میں عنصر حیات شامل نہیں ہوتا۔ ۳ سفید سلول (...) سے مراد وہ مادہ ذی حیات ہے جس سے تمام زندہ وجود بنے ہیں یعنی نباتات، حیوانات اور انسان،

جیسا کہ کیمیائے حیاتی[۵۱] کے عام علماء کا دستور ہے، تو عنصر حیات جو مادۂ ذی حیات (یا موجود حیہ) کا طغرائے امتیاز ہے، ہاتھ نہیں آتا یعنی مادۂ ذی حیات کی کیمیاوی تحلیل ایسے اجزاء پر مشتمل ہوتی ہے، جو خود ذی حیات نہیں ہیں، تو کیا ایسی تحلیل سے ہمیں حیات کا ادراک ہوا ہے، ؟ ہرگز نہیں یہ عجیب تحلیل ہے کہ جس مقصد کے لئے یہ عمل کیا جا رہا ہے، وہ مقصد ہی فوت ہو گیا ہے، کیا ان غیر ذی حیات کیمیاوی اجزاء کا مجموعہ ذی حیات بن جاتا ہے؟ ہرگز نہیں، زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں، کہ بعض اوقات جب یہ کیمیاوی اجزا ایک خاص مجموعہ کی شکل اختیار کرتے ہیں، تو ان کے اتصال و اجتماع کے بعد یا ان کے اتصال و اجتماع کے ساتھ ہی ایک نئی خاصیت کا ظہور ہوتا ہے، اور یہ نئی خاصیت بطور نتیجہ ظاہر نہیں ہوتی، بلکہ ایک ہمراہی، یا ساتھی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے،

"علم حیات" اگر صرف عمل تحلیل پر مبنی ہوگا تو زیادہ سے زیادہ وہ یہ کر سکتا ہے کہ عنصر حیات کی موجودگی کے لئے جو طبعی اور کیمیاوی شرائط ضروری ہیں، ان کا ادراک کر لے لیکن خود عنصر حیات کے متعلق یہ علم خاموش ہوگا، اس وجہ سے ایسے علم حیات کو حیات کا علم کہنا بجا نہیں، ظاہر ہے کہ یہاں بھی تحلیل خالص کا فارمولا (ا = ج + د) صحیح نہیں ہے، اگر ا ایک ذی حیات وجود ہے، اور اسکی طبعی و کیمیاوی تحلیل سے ہمیں چند اجزاء "ج اور د" ہاتھ آتے ہیں، تو ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں، کہ اگر ج اور د کو ا سے خارج کر دیا جائے، تو ا (یعنی وجود ذی حیات) باقی نہ رہے گا، لیکن اگر ہم یہ نتیجہ نکالیں کہ ا = ج + د تو ہم مغالطہ میں ہیں، صحیح فارمولا وہی ترکیبی گر ہوگا، کہ "ج اور د" یعنی طبعی و کیمیاوی عناصر صرف اس صورت میں ا کے عناصر کہلائے جا سکتے ہیں، جبکہ انسان کے اتصال یا اجتماع سے صرف ا پیدا ہو یعنی ا = ج + د + اجد،

میکانیوی علمائے حیاتیات (وہ علماء جو "وجود حیہ" کی طبعی و کیمیاوی تحلیل پر قانع ہیں، اور

۵۱. Organic Chemis ty.

اسی کو "حیات" کا صحیح ادراک سمجھتے ہیں) کے طرز استدلال کو دیکھ کر اقبال کا یہ فلسفیانہ[۵۲] قطعہ یاد آتا ہے،

بلند بال تھا لیکن نہ تھا جسور و غیور / حکیم سر محبت سے بے نصیب رہا،
پھرا فضاؤں میں کرگس اگرچہ شاہیں وار / شکار زندہ کی لذت سے بے نصیب رہا،

سفیدۂ سلول کی اجزائے غیر حیہ میں بہ احتیاط تحلیل کے بعد میکانوی منکر حیاتیات اپنے ہاتھ میں وہ عنصر نہیں پاتا، جس کے صحیح ادراک کے لئے وہ عمل تحلیل استعمال کر رہا تھا، اگر وہ اس ناکامیابی پر کف افسوس ملتا، تو ہم کہہ سکتے تھے، کہ شاہی علم کے پنجہ سے شکار نکل گیا، لیکن وہ تو عمل تحلیل پر قانع ہے، اور اس مغالطہ میں ہے کہ "حیات" مرکب ہے غیر ذی حیات عناصر سے اس لئے وہ مستحق ہے کہ اسے فضائے علم کا "کرگس" کہا جائے،

پس ثابت ہوا کہ جس طرح غیر حیہ وجود مخلوط کے صحیح و مکمل ادراک کے لئے تحلیل محض ناکافی و گمراہ کن تھی، یا جس طرح تحلیل محض شعور کے صحیح ادراک کے لئے ناکافی بلکہ گمراہ کن تھی، اسی طرح (بلکہ اس سے بھی زیادہ شدت سے) یہ عمل تحلیل وجود حیہ کے صحیح و مکمل فہم و ادراک کے لئے ناکافی و گمراہ کن ہے،

۶۔ اب ہمیں ایک قدم اور آگے بڑھنا چاہیئے،

کیا محض و خالص عمل تحلیل سے ہم معاشرتی، سیاسی اور اخلاقی حوادث کی اہمیت، اور ان کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں، ؟ کیا صرف اس عمل کی مدد سے ہم ان حوادث کی علل کی معرفت حاصل کر سکتے ہیں، ؟

اوپر ہم دیکھ چکے ہیں، کہ شعور کے متعلق تحلیل خالص کا فارمولا بالکل غلط ہے، یہی حالت ہمیں معاشرتی سیاسی اور اخلاقی حوادث کے تحلیلی طریق فہم کی نظر آتی ہے، افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ سیائین، مفکرین

۵۲. بال جبریل صفحہ ۲۱،

اجتماعیات، اور فلاسفۂ علم الاخلاق بالعموم اس طریقِ تفکر پر اپنا استدلال قائم کرتے ہیں، حالانکہ ایسے استدلال کے نتائج نہایت نقصان دہ ثابت ہوئے ہیں،

مثلاً مذہب مفیدیت[۵] کا نظریۂ خیر و شر لیجئے، اس مذہب کے مطابق کسی چیز کا خیر یا شر، نیک یا بد ہونا صرف اس امر پر منحصر ہے کہ وہ چیز کس حد تک عوام کے لئے مفید ہو سکتی ہے، اخلاق کا بہترین معیار اس مذہب میں یہ ہو کہ عوام زیادہ سے زیادہ تعداد میں اور زیادہ سے زیادہ حد تک خوشی حاصل کر سکیں، اور خوشی اس شے سے حاصل ہوتی ہے، جو مفید ہو، گویا کہ اخلاق کا تنہا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ عوام کثیر تعداد میں مفید اشیا سے زیادہ سے زیادہ خوشی حاصل کر سکیں، جو شے اس طرح مفید نہیں ہے، یعنی جس سے عوام کو خوشی (فوراً یا کچھ عرصہ کے بعد) حاصل نہ ہو، وہ خیر نہیں ہے، بلکہ شر ہے، اور ایسی شر انگیز اشیا کی خواہش کرنے والا شخص نیک نہ ہوگا، بد ہوگا،

مذہب مفیدیت کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ جماعت (سوسائٹی) مرکب ہے، اشخاص سے اور ہر شخص کم و بیش آزاد ہے، اسکی جبلی خواہش یہ ہے، کہ حتی المقدور لذت اور خوشی کو حاصل کرے (جلب منفعت) اور درد و زحمت سے بچا رہے، (دفع مضرت) ایسے آزاد اشخاص جن کی سرشت کے جبلی قوانین جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت ہیں، باہم دگر مل کر ایک جماعت پیدا کرتے ہیں، اور اس جماعت کا مشترکہ اخلاقی قانون یا نصب العین یہ ہوتا ہے یا ہونا چاہئے (اس بارہ میں مفیدین کے دو فرقے ہیں) کہ جماعت کا ہر فرد پوری جماعت کیلئے جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت کا خواہاں ہو، اور صرف اسی مقصد کے لئے کوشاں رہے،

یہاں مفیدیت کی مفصل تنقید کا موقع نہیں، مختصراً عرض ہو کہ یہ مذہب نفسی اور استدلالی حیثیتوں سے بہت کمزور ہے، اسی لئے آج کل خالص مفیدیین بہت کم نظر آتے ہیں، اس کمزوری کی وجہ صرف یہ ہے کہ مفیدیت نے فرد انسانی کی نفسی تحلیل میں دو فاش غلطیاں کی ہیں، اول یہ کہ اس نے ہر انسان

[۵] Utilitarianism

کو جبلی طور پر صرف جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت کا پرستار اور حاصل بنا دیا، حالانکہ روزمرہ کی زندگی میں ہر فرد واحد بیسیوں ایسے کام کرتا ہے، جن میں اسے نہ جلبِ منفعت کا خیال ہوتا ہے اور نہ دفعِ مضرت کا، یہ کام صرف اسلئے کئے جاتے ہیں، اگر کسی نہ کسی وجہ سے انہیں کئے بغیر چارہ نہیں جب ہمیں بھوک لگتی ہے، تو ہم کھانا کھاتے ہیں، صرف اسلئے کہ کھانا سامنے موجود ہے، اور بھوک لگ رہی ہے، یہ صحیح ہے کہ کھانا کھانے میں کچھ لذت حاصل ہوتی ہے، بھوک کی جو تھوڑی بہت زحمت تھی، وہ دور ہو جاتی ہے، ہمارے جسمی نظام کو فائدہ پہنچتا ہے، اور کھانا نہ ملنے سے جو مضرت لابدی تھی، وہ دفع ہو جاتی ہے، لیکن کھانا کھاتے وقت یہ خیالات یا یہ خواہشات اس عمل کی محرک نہ تھیں، کھانا سامنے تھا ہم سے کھائے بغیر نہ رہا گیا، جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت کا فلسفہ سیر ہو جانے کے بعد ذہن میں آ سکتا ہے، ایک اور مثال لیجئے، عورت جب بچہ جنتی ہے، تو کیا اس کے دل میں دفعِ مضرت اور جلبِ منفعت کا خیال ہوتا ہے؟

دوسری فاش غلطی مفیدیت نے یہ کی، کہ اس نے فرد واحد کی نفسی تحلیل کو (حالانکہ انسانی محرکات کی یہ تحلیل بھی غلط تھی، جیسا کہ ہم ابھی دیکھ چکے ہیں) جماعت (جو ان افراد سے مرکب ہے) کی نفسی تحلیل سمجھ لیا یعنی یہ غلط خیال اپنے نظریہ اور استدلال میں داخل کر لیا، کہ اگر افراد زید، بکر، عمرو کے نفسی محرکات فرداً فرداً ک، م، ن ہیں، تو اگر زید اور بکر اور عمرو ملکر ایک منظم جماعت قائم کریں، تو اس جماعت کے نفسی محرکات صرف یہ ہونگے، ک، م، ن، حالانکہ یہ خیال ہر لحاظ سے قطعاً غلط ہے، بہت ممکن ہے کہ اس جماعت کے نفسی محرکات میں ک، م، ن کے ساتھ کسی نئے محرک ع کا بھی اضافہ ہو جائے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ک م ن سرے سے غائب ہی ہو جائیں، اور ان کے بجائے بالکل نئے محرکات پیدا ہو جائیں، اگر زید اور بکر اور عمرو، فرداً فرداً جبلی طور پر ضعیف الارادہ اور بزدل ہیں، تو کوئی تعجب نہ ہوگا، اگر وہ من حیث الجماعت قوی الارادہ اور شجاع ثابت ہوں، ایک

اور ایک گیارہ ضرب المثل ہے، اور اسی حقیقت کو ظاہر کرتی ہے،

یہاں اس حقیقت کی مزید تفصیل کی گنجایش نہیں، مقصد صرف یہ تھا کہ مذہب مفیدیت کی اس بنیادی غلطی پر غور کیا جائے، کہ اوّل تو اس نے فردِ انسان کے نفسی محرکات کی غلط تحلیل کی، پھر اس غلط تحلیل کو جماعتِ انسانی کے متعلق صحیح سمجھا، مزید برآن یہ کہ ان دو فاش غلطیوں کو اپنے فلسفۂ اخلاق کی بنیاد بنا دیا، اگر مفیدیین نے تحلیل کے ساتھ ترکیب پر بھی غور کیا ہوتا، تو کم از کم انھیں دوسری غلطی سے دوچار نہ ہونا پڑتا، اور تیسری غلطی کی باری نہ آتی، وہ فوراً پہلی غلطی (یعنی محرکات انسانی کی نامکمل تحلیل) کی طرف رجوع کرتے، اور کیا تعجب ہو کہ وہ اپنے جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت والے غلط نفسیاتی قانون کے شکار نہ ہوتے،

ستم یہ ہے کہ مفیدیت کے مخالفین اور معترضین نے بھی اپنی تنقیدی گولہ باری زیادہ تر مفیدیت کی پہلی غلطی پر کی ہے، یعنی ان کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ مفیدیت غلط اسلئے ہو کہ اُس نے انسانی محرکات کی غلط اور نامکمل تحلیل کی، اور اسی غلط تحلیل پر اُس نے اپنا نظریۂ اخلاق قائم کیا، ان معترضین کا خیال ہے کہ اگر عملِ انسانی کے محرکات کی تحلیل مکمل کی جائے، تو وہ تمام الجھنیں خود بخود سلجھ جائینگی جن سے مفکرِ اخلاق کو قدم قدم پر دوچار ہونا پڑتا ہے، الغرض مفیدیین اور ان کے معترض دونوں عملِ تحلیل ہی کو اہم اور قاطعِ مشکلات سمجھتے ہیں، مفیدیین نے تو سرے سے عملِ ترکیب استعمال ہی نہیں کیا، اور نہ ان میں اس کی ضرورت کا خیال پیدا ہوا، لیکن ان کے معترضین عملِ ترکیب کی اہمیت اور ضرورت کا زبانی اقرار تو ضرور کرتے ہیں، البتہ حقیقت یہ ہے، کہ ان کے اپنے استدلال میں بھی تحلیلیت کا تعصب پایا جاتا ہے، علم معاشرت کے وہ مفکرین جنھیں نفسیاتِ معاشرت سے دلچسپی یا واقفیت ہو، بڑے شد و مد سے اس حقیقت کا اقرار کرتے ہیں، کہ جماعت محض افراد کا مجموعہ نہیں ہو، اور آجکل کے مفکرین علم الجماعت نسیائین، اور اخلاقیین کی اکثریت بھی اسی حقیقت کی اقراری ہو لیکن یہ ماننا پڑتا ہو،

کہ یہ اقرار عملی نہیں بلکہ زیادہ تر زبانی ہو، ان کی تصانیف میں جو اہمیت عملِ تحلیل کو دیجاتی ہو، وہ عملِ ترکیب کو نصیب نہیں،

ان مفکرین کا یہ خیال غلط نہیں ہو کہ اسوقت تک ان علوم کو جو ناکامی معاشرتی، اقتصادی، اخلاقی اور سیاسی مشکلات اور پیچیدگیوں کے حل کرنے اور ان کے صحیح علاج کی دریافت مین ہوئی ہو، وہ بہت حد تک نامکمل تحلیل کی وجہ سے ہو، اور اگر ان تمام مبہم تاریک اور دقیق محرکاتِ عملِ انسانی کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کیا جائے جو اسوقت تک نظرانداز ہوتے رہے ہین، تو اغلب ہو کہ بعض عقدوں کی کشایش ہو جائیگی اور بعض مشکلات خود بخود حل ہو جائیں گی، مثلاً ہم نے اوپر دیکھا ہے، کہ دانستہ جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت بہت کم مواقع میں نفسی محرک کا کام دیتی ہے، اس کے علاوہ سینکڑوں اور محرکات ہین جو بالکل جبلی ہیں، اٹل ہیں، ہمارے قابو سے باہر ہیں، اور اپنی گرفت میں سخت مضبوط ہیں، اور یہ محرکات جسمانی بھی ہیں، ذہنی بھی، اور روحانی بھی، ہمیں پہلے ایسے محرکات کا صحیح اندازہ کرنا چاہئے، جب کہیں جاکر ہم اس قابل ہوں گے، کہ اخلاقیات، معاشریات، سیاسیات، اور اقتصادیات کی بنیادیں استوار کریں،

یہ سب کچھ صحیح ہے، لیکن اگر عملِ ترکیب کی اہمیت اور طریق کار کے متعلق جو کچھ گذشتہ صفحات میں عرض کیا گیا ہو صحیح ہو، تو اس حقیقت کا ہمیں اعتراف کرنا پڑیگا، کہ محرکاتِ عملِ انسانی کی نفسی تحلیل خواہ کتنی ہی مکمل کیوں نہ ہو جب تک فردِ انسان اور جماعتِ انسانی کے نفسیات کو ترکیبی نقطۂ نگاہ سے دیکھا نہ جائیگا، (اور اس وقت نفسیات کے مختلف شعبوں نے کافی مواد جمع کر دیا ہو) اس وقت تک اخلاقیات، معاشریات، اقتصادیات اور سیاسیات کے علوم تشنہ و ناکام رہیں گے، بلکہ یوں کہئے کہ انسان اور جماعتِ انسانی کے حق میں یہ علوم اسی طرح مضر رہیں گے، جیسے کہ اب تک رہے ہیں، فی الحال تو ان علوم کی تحلیلی کوششوں پر کرگس نے پر پھیلا رکھے ہیں، بات یہ ہو کہ محض تحلیل کی مدد سے علومِ انسانی کی پیچیدگیاں حل کرنے کی کوشش کرنا، اصولاً غلط ہے،

(باقی)

حضرت ظہیر بلگرامی

از

ازجناب حامد حسن صاحب، ام اے، بلگرامی

خاندان صانع کے چشم و چراغ حضرت منشی محمد مسعود صاحب کے فرزند ارجمند جناب منشی ظہیر الدین خان المتخلص بہ ظہیر نے اپنے زمانہ میں جو عزت و ناموری حاصل کی، وہ آج ایک بھولا ہوا افسانہ معلوم ہوتی ہے، جس طرح آپکے حالات زندگی ایک عرصہ تک تاریکی میں پڑے رہے، اسی طرح آپ کی بیشمار قابل قدر تصانیف طاق نسیاں کے حوالہ ہوگئیں، مجھے جو کچھ حالات استاد مکرم حضرت مولوی محمود صاحب حمد بلگرامی سے دستیاب ہوئے، وہ مختصراً تحریر کرتا ہوں، جناب حمد صاحب بلگرامی حضرت ظہیر بلگرامی کے فرزند اور اس خاک بلگرام کی آخری عظمت ہیں،

حضرت ظہیر کی پیدائش کا فخر بلگرام کے محلہ قاضی پورہ کو حاصل ہے، آپ ۱۲۱۰ف میں پیدا ہوئے، ظہیر الدین اسی فصلی حساب سے تاریخی نام ہے، کچھ عرصہ تک تو بلگرام ہی کی ادب نواز گلیوں میں تربیت پاتے رہے، اور یہیں کے استادوں سے ابتدائی تعلیم حاصل کرتے رہے، سات سال کی عمر میں ان کے والد بزرگوار منشی مسعود نے انھیں لکھنو بلا لیا، منشی صاحب اس وقت سعادت علی خان کے دربار میں ایک ممتاز ہستی تھے، اپنی زیر نگرانی ہونہار بچے کی تعلیم شروع کرائی، تقدیر کا ستارہ بلندی پر تھا، نواب معتمد الدولہ سید محمد خان ضیغم جنگ ان سے محبت کرنے لگے، اور اپنے بیٹے کی طرح سمجھنے لگے، اسلئے وزراء اور سلاطین کے بچوں کیساتھ تعلیم ہونے لگی، اور آپ امجد علی شاہ کے ہم مکتب ہوئے، یہیں

دونوں راہ و رسم کی ابتدا ہوئی، اس صحبت نے ایک طرف ان میں اعلیٰ دماغی اور بلند ذہنیت پیدا کردی لیکن یہی ناز پروری تحصیل علم میں سدراہ بن گئی، ان کی ۱۲ سال کی عمر تھی، کہ غازی الدین حیدر کی مسند نشینی کا زمانہ آیا، اس کے کچھ ہی دنوں بعد باپ کی مرضی کے خلاف انھیں تعلیمی مشاغل سے اٹھا کر دفتر وزارت میں انشا، اور مسودات نویسی کی خدمت سونپی گئی، اس کم سنی میں اس خدمت کیلئے انتخاب انکی استعداد و صلاحیت کا ثبوت ہے، ان کی خوش قسمتی سے ۱۲۳۵ھ میں ان کے شفیق اور سرپرست نواب معتمد الدولہ وزیر اعظم مقرر ہوئے، حضرت ظہیر نے لفظ "وزیر اعظم" سے تاریخ نکالی ۱۲۳۹ھ میں ان کے والد ماجد منشی مسعود صاحب کے انتقال کے بعد نواب صاحب نے والد کے خدمات کا لحاظ کر کے ان کو ترقی دیکر دفتر وزارت کا سکریٹری بمنزلہ نائب وزیر بنا دیا، اور "دبیر الانشا" منشی ظہیر الدین خان بہادر نام و خطاب ہوا، اس کے بعد ہی خلعت زرین اور جیغہ مرصع مروارید عطا ہوا، ملکی سیاسیات اور آپس کے اختلافات کی وجہ سے محمد علی شاہ کے زمانہ میں یہ کچھ عرصہ کے لئے معطل بھی ہوگئے، لیکن حاسدوں کی فریب کاریاں زیادہ دنوں تک نہ چلیں، اور آپ ۱۲۵۹ھ میں حضرت امجد علی شاہ کی سفارش سے نیابت جرنیل و میر بخشی گری پر مامور ہوگئے، نیابت درحقیقت برائے نام تھی، کل کام یہی انجام دیتے تھے، نواب امین الدولہ بہادر نے بھی اپنے خانگی امور و دفتر وزارت کے کل اختیارات انہی کے سپرد کردیے تھے، اور کوئی کام بغیر ان کے مشورے کے نہ کرتے تھے، اس طرح واجد علی شاہ کے زمانہ تک آپ سلطنت کے آغوش عشرت میں پرورش پاتے رہے، اور اس کے دامن سے وابستہ رہے،

واجد علی شاہی دور میں بادشاہ سے لیکر رعایا تک عیش و نشاط میں ڈوبے ہوئے تھے، لیکن حضرت ظہیر کی طبیعت کا رنگ نمایاں طور سے بدلنے لگا، کچھ عمر کے تقاضے اور کچھ عبرت آموزی سے اسی زمانہ میں آپ کو موت کا خیال اور آخرت کی فکر ہونے لگی، چنانچہ ۱۲۶۲ھ میں آپنے اپنے والد بزرگوار کی قبر کے پاس اپنی قبر بنوائی، اور تین دن برابر اس صحرائی گورستان میں آرام کیا کہ طبیعت

مانوس ہوجائے وہیں نماز پڑھتے، اور خود اپنا یہ شعر آہستہ آہستہ ترنم سے پڑھا کرتے،

شدم آہ ور انتظارت ہلاک　　بیا اے اجل زود روحی فداک

پنجشنبہ کے دن عموماً عصر سے عشا تک جہاں تک ہوسکتا، قبرستان ہی میں رہتے، قبر کو غلہ سے بھروا کر غلہ خیرات کر دیتے،

زمانہ پلٹا واجد علی شاہی کا آفتاب غروب ہوا، بادشاہ مٹیا برج کی چار دیواریوں میں زندگی کے آخری دن گذارنے کے لئے روانہ کر دیا گیا، کچھ درباری اور احباب بھی ساتھ ہوئے، شاہ نے حضرت ظہیر سے ساتھ چلنے کی خواہش کی، لیکن اب ان کو کچھ اور ہی لو لگی تھی، دست بستہ عرض کیا کہ اب قبر سے الفت ہوگئی ہے، اگر اجازت ہو، تو یہیں پیوند زمین ہو جاؤں، وہاں سے میری لاش کون لائے گا، اور نہ گئے، یہ معذرت قبول ہوئی،

غدر کے بعد گورنمنٹ کو عطاے وثیقہ کے لیے مستحق اشخاص کی فہرست مرتب کرنے کی ضرورت ہوئی، اس میں ظہیر سے بھی مدد لی گئی، ان کی اعانت سے کئی حقداروں کو ان کے حقوق ملے، اب بھی ان کی تصنیف کردہ کتاب "ضبط قوانین دفعات و وثائق" دفتر وثیقہ میں موجود ہے،

ان کی زندگی کے آخری زمانہ میں جب کیننگ کالج کھلا، تو ان سے اسکی مدرسی قبول کرنے کی استدعا کی گئی، لیکن اب طبیعت پابندیوں سے آزادی چاہتی تھی، اس لئے بڑی مشکل سے مدرسی قبول کی، لیکن پابندیوں سے یہاں سے بھی آزاد ہی رہے، ایک بار پرنسپل نے حکم دیا، کہ لوگ اپنی تنخواہ لینے خود آیا کریں، حضرت ظہیر کی خودداری کو اس سے ٹھیس لگی، کہلا بھیجا کہ روپیہ فقیروں کو بانٹ دیجئے، میں گداگری کرنے نہیں آیا، یہ کہلا کر ملازمت سے استعفا دیدیا، لیکن کچھ دنوں کے بعد پھر بلائے گئے، اور زندگی کے بقیہ دن وہیں گذارے، ۱۲۹۲ھ میں آٹھویں ذی قعدہ شنبہ کے روز فجر کی نماز کے بعد انتقال فرمایا، اور اسی قبر میں جس سے زندگی میں مانوس ہونے کی عادت ڈالی تھی، میر واحد علی صاحب کی کوششوں سے مدفون ہوئے، جناب منشی محمود صاحب احمد بلگرامی نے تاریخ کہی،

صباح ہشتم ذی قعدہ روز شنبہ　　ظہیر رفت زدیر فنا بدار سلام

نوشت خامہ ام اے احمد مصرع تاریخ　　روانہ والدمن شد بسوئے ارم بمرام

۱۲۹۲ھ

وضع و لباس

حضرت ظہیر لکھنو کے لطیف طبع لوگوں میں شمار ہوتے تھے، ہر سال نئی نئی پوشاکیں دور دور سے تیار کرا کے منگاتے، کشمیر سے اپنی پسند کے کپڑے بنواتے، اودھ میں ان کی خوش لباسی حکایت کے طور پر مشہور تھی، لیکن غدر کے انقلاب میں سارا اثاثہ لٹ گیا، پھر بھی جو دو چار چیزیں بچ گئی تھیں، وہ بے نظیر تھیں، غدر کے بعد کا واقعہ ہے، ایک مرتبہ مہاراجہ سردر گجی سنگھ بہادر والی بلرام پور و تلسی پور ایک بیش قیمت پشمینہ جو انھوں نے کشمیر سے منگایا تھا، حضرت ظہیر کو دکھا کر کہنے لگے، کہ آپ سے زیادہ اس کا قدرشناس کون ہوسکتا ہے، منشی جی نے دیکھ کر فرمایا جی ہاں اچھا ہے، مہاراج بولے کہ اگر پسند ہو تو حاضر ہے، حضرت ظہیر متبسم ہوئے اور خدمتگار کو اشارہ کیا، وہ مکان سے ایک دوشالہ جو نصیر الدین بادشاہ اودھ کی خاص پوشاک میں تھا، اور ان کو بطور خلعت عطا ہوا تھا لایا، منشی جی نے اسے مہاراج کے سامنے پیش کر کے فرمایا، کہ میں اب ضعیف ہوگیا ہوں، یہ پرانے کپڑے جسم چھپانے کے لئے کافی ہیں، اب یہ لباس اس قامت خمیدہ پر زیب نہ دے گا،

سلاطین سے تعلقات

حضرت ظہیر کی مراسلت اکثر امراء و سلاطین سے رہتی تھی، آپ نے غالب کی وساطت سے ۱۲۶۹ھ میں اپنی ایک نظم "صراط المستقیم" بادشاہ دہلی کی خدمت میں بھیجی تھی، جس کے صلہ میں بادشاہ کی جانب سے ان کے خطابات میں اضافہ کیا گیا، ان کی وہ مہر جس پر ان کے سب خطابات اور نام کندہ ہیں، میری نظر سے گذری ہے، وہ یہ ہے :-

"رفیق الدولہ دبیر الانشا، محمد ظہیر الدین خان بہادر مرید خاص حضرت ابو ظفر سراج الدین

محمد بہادر شاہ، بادشاہ غازی، خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ"

بادشاہ دہلی کی ایک تحریر بھی جو منشی جی کے نام تھی، دیکھنے کا موقع ملا ہے، اس کے بعض فقرے یہ ہیں:۔

"حقائق معروفہ مکشوف گردید، منظومات ملفوفہ بملاحظۂ قدس رسید بسیار پسند طبع گردید

جلد ثانی و رسالہ مرأۃ الاشیا مع التفاسیر بمقتضائے مراحم خسروی مرحمت شدہ است۔"

جس زمانہ میں شاہ اودھ واجد علی شاہ کلکتہ میں اقامت پذیر تھے، حضرت ظہیر نے ایک کتاب سیر السلطان لکھی تھی، یہ نظم میں واجد علی شاہ کی سوانح عمری تھی، اس میں خاص صنعتیں رکھی گئی تھیں جس کی تفصیل منشی صاحب نے اپنے ایک خط میں کی ہے جو اپنے کتاب کے ساتھ واجد علی شاہ کو بھیجا تھا، منشی جی کے اس خط کے ساتھ واجد علی شاہ کا خط بھی نقل کیا جاتا ہے،

نقل خط

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اے خامہ ادب کن کہ مقام ادب است این — این جا چو زسر پا نکنی بس عجب است این

از چوب سیہ بیش نہٗ خود حطب است این — گر مرتبۂ خود نشناسی غضب است این

ہان این قدر البتہ ترا قدر نہادند — آنجا تو رسیدی کہ مرا بار نہ دادند

صبا اگر گذرے افتدت بکوے کسے

مزاج دیدہ تواں کرد گفتگوے کسے

حضرت ظل سبحانی خلیفۃ الرحمانی، قبلۂ عالم و عالمیان، و دستگیر درماندگان پرورش فرمائے

غلامان و قدیمان عز نصرہ و ضاعف قدرہ،

عرضی

بجناب عالمیان باب

"از آنجا کہ فیض انعام عام بادشاہی چوں رحمت عام نامتناہی بر جمیع خاص و عام امت

این پیر غلام قدیم کہ از دو پشت خود و شش دورہ این سلطنت اودھ از عہد جنت آرامگاہ

تا اوائل عہد حضرت سلطان عالم بکار گذاری و خدمات عمدہ این سرکار مدۃ العمر بسر بردہ

ہنگام کنارہ کشی کار متعلقہ بنظر قدیم پروری و بے قصوری دو صد روپیہ مشاہرہ معینہ خانہ

زاد ماہ بماہ بواسطہ نواب وزیر اعظم حضور عالم می رسد و ہر روز بلا ناغہ در مصاحب منزل

نزد فتح الدولہ بہادر مرحوم نہیب خود حاضر می ماند، مگر دولت ملازمت کہ مقدور نبود

میسر نہ شد ع

آن کیست کہ تقدیر کند حال گدا را در حضرت شاہ

از نغمۂ بلبل چہ خبر باد صبا را جز نالہ و آہے

بہر حال چوں باوجود صرف شاہی مشاہرہ معینہ بیکار خوردن و کارے نہ کردن گوارا

نہ شد، لاجرم در ہمان ایام برائے شغل بے کاری چنان بخاطر گذشتہ بود کہ کتابے

بطور تاریخ شعر بر حالت خاص حضرت سلطان عالم از ابتدا تا انتہا، بعبارت صاف

صاف عام فہم ترتیب دادہ آید، کہ یادگار باشد، و ہمہ حال راست براست بیان واقعی

و صحیح درو درج کردہ شود، لہذا بتحقیقات حالات و حکایات ہمت و سخاوت و دگر و

تصانیف خاص و روزنامچہ و سوانح عمری حضرت اقدس و اعلیٰ اہتمام و کوشش با بکار بردہ

کتابے تصنیف تازہ ایجاد کردہ بود کہ ہر ہر فقرہ بلکہ ہر لفظ و حرف سنہ جلوس و ہم

سنہ ہجری اوّل جلوس حضرت سلطان عالم و ہم اعداد نام حضرت اقدس و اعلیٰ و ہم

سنہ تصنیف کتاب در و بر می آید، و نام کتاب سیر السلطان سوانح واجدی قرار داده بود، ہنوز نوبت گزشتش نہ رسیده بود، که گزشت انچہ گزشت، بعدہٗ که درین کسر و انکسار عام مسوده اش نیز با تمام خانہ و خانماں وقت غارت و تاراج عام شد زندگی وبال جان گردید، درچنیں زندگی بدتر از مرگ که عالمے در عالم لایموت فیہا ولا یحیٰی بصد حسرت و یاس بسر می برد، کجا ہوش و حواس که دست بخانہ آشنا کند، که دفعۃً درچنیں عالم یاس انعام فیض عام سلطان عالم جانی تازه در قالب مقتولان خنجر یاس در دمیده از سر نو حیات تازه بخشید و مفہوم ینزل الغیث مما قنطوا وینشر رحمتہ ہویدا کرد ایں زده دل ہم باہمہ افسردگیہا تاب ضبط در خود ندیده روا نداشت که ذکر چنیں سلطان عالم نمونہٗ رحمت الٰہی خصوصاً چناں بذل عام از صحائف تاریخ معرا باشد، انصاف در کار است که از آدم تا ایندم چہا کتب تواریخ از حالت اسخیاے زمان بر ریز اند، مگر ہما ہنگام دولت و مقدرت بہ ہنگام سوال سائلاں را بقدر مقدور عطا کرده باشند نہ درچنیں حال، و در از حال وچناں بے مقدوری ہا، که ظاہر است بدون سوال از طلب ہمہ دور افتادگاں را یک یاد فرموده انعام ہا چہ بلکہ حیات تازه جاں بخشید، کہ اگر اجل موقت مانع نبودی، خوف شادی مرگ بود انصاف رود که از ابتداے عالم تا این دم کسے را اگر بایں صفت نشان دہند، که باہمچو ابتلا ہاے ذاتی و صفاتی چناں عطا ہاے عام عند العسرت کرده باشد، اینک خانہ زاد خام دعوی از دست می اندازد، لہٰذا ترتیب ہمچو کتاب ملتوی داشتن روا نداشتہ اشعار صنعت اعداد تاریخ کہ مسوده اش بارے محفوظ بود، بطور نمونہ لف عرضداشت کرده شد، تا اگر ایما شود دگر رسائل تصانیف حضرت اعلیٰ که در ہر علم جدا جدا شنیده می شود مع دگر حکایات

وسوانح عمری و روزنامچہ اگر بدست آمدن تواند ایں نفسے چند ہمیں تصنیف و تالیف بسر برده کہ بدولت ہمچو ممدوح نام مداح ہم بر صفحۂ روزگار یادگار خواہد ماند، فقط نیر ماه و جلال چوں روبیمش للعلوۃ الوسطیٰ باز باوج دولت و اقبال عروج فرمایاد بمجد النہ الامجاد،

قطعہ تاریخ مذکور این است

کجا است چشم کہ بیند بدیدۂ ادراک
کدام شے کہ درو نیست آیتے ز خدا

بہ ذره ذره عیان است منظر دانش
اگر یقیں نہ کنی میدہم نظیر ترا

الخ

سلطان نے اسکی بہت قدر کی، اور جو جواب دیا وہ حسب ذیل ہے،

"دبیر الانشاء منشی محمد ظہیر الدین بعافیت بوده بداند، شعاع آفتاب کلامش چناں بر ذرہ دلم تابید کہ سرتا پا محو گردیدم و چون در حساب سیاق و تخرجہ و تعمیہ در بدیہیات و تاریخ محض چوب ناتراشیده ام، لہٰذا حسب العرض اشعار تاریخ گذرانیده اش را برائے فہمید نزد سلطان العلماء، مسیح الدولہ بہادر و منشی جانکی پرشاد کہ مخزن استعداد و جواہر قابلیت اند فرستاده ام مگر صفائے بندش و حسن کلامش دریافتیم بہر دو دست دل گرفتہ ماندم بخدا کہ ہرگز قابل و لایق چنیں تحریر بے نظیر نبودم و لطف و کیفیت و جدانی از لب نمی خیزد، مگر انچہ دل ریزد دل برد، صلہ اش بعوض ہر لفظ یک گنج مروارید است، مگر این زمانہ مبلغ پنجاه روپیہ در ماہ از برائے ضرورت تیاری سیر السلطان سوانح واجدی مقرر نمودم بکتبہ و نوجره، یک صد و بست و چہار عدد کہ از نام راقم بر می آید، سبحان اللہ رمزے از عمر را و سنہ طبعی پیداست و ہر انچہ در بارۂ رسائل تصنیف راقم در فنون جداگانہ مع دیگر روزنامچہ و سوانح عمری عرضداشت صورتش بریں گونہ کہ تالیفات و تصنیفات عمده را سیل غارت باغبان ہمچو خس و خاشاک در امواج تاراج چناں غرق ساخت کہ اثر حرفی

ازان باقی نیست در روزنامچہ وسوانحمری جز آہِ جگر و دودِ دل مضطر با شام زندان باجسم عریان، یابحر اشک یا تقادم رشک دور از یاران گشتہ، ومجروح سیوفِ فراق زمان وفرزندان حالا اگر حبیبت، بہرحال اگر از اقتباس انوارم گونہ لذتے وآگہی داشتہ باشد کالشمس فی النہار است، ؎

حاجتِ مشاطہ نیست روے دل آرام را

حبذا کہ از کلکِ صداقت سلکش بمطالعہ راقم درآید، بدانکہ ہمہ تن مشتاق مشاہدہ آن تحریر دلپذیر صدق نظیرم در ارسالش دیر نباید ساخت و مبلغ ویک صد و بست وچہار روپیہ برائے نثار حروف واعداد نام راقم دوازدہ عدد اشرفی جہت وزن شکل ہندسہ و مبلغ شصت وسہ روپیہ بنا بر تحصیل شصت وسہ روپیہ سرو پائے جلوس میمنت مانوس و دوازدہ اشرفی دیگر برائے اضافہ شصت وسہ مبلغ دو عدد جلوسی ویکہزار و دوصد شصت وسہ روپیہ مطابق عدد سنہ جلوس ہجری و دوازدہ اشرفی بعدۂ اسم ذات و دیگر شصت وشش عدد اشرفی باعداد اسم ذات اعنی اللہ موافق فہمید خود باد عنایت نمودیم مابقی بعد فہمید جملہ مع حساب مشہور ومبالغ دو ہزار ونہ صد و دہ روپیہ می شوند، از میر واجد علی ستاند ور سید ارسال دارد تنخواہ خود بحساب مرقومۂ بالا از کاتب الملوک منشی محمد شفیع الرضوی حسب ضابطہ ماہ بماہ وصول کردہ باشد بقلم پرور دالم بیجد ال جانعالم اختر مورخہ بست ونہم شوال المکرم ۱۲۷۵ھ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم،

عزت و شہرت عزت و شہرت اکتساب سے زیادہ رحمتِ الٰہی کا عطیہ ہیں، حضرت ظہیر کو یہ عطیہ پروردگارِ عالم کے دربار سے ان کی زندگی ہی میں مل گیا تھا، عزت و اقتدار کے نمونے گذشتہ اوراق میں گذر چکے ہیں، خدا نے علمی دنیا میں بھی ان کو عزت و شہرت کا وافر حصہ عطا فرمایا تھا،

اس زمانہ کے ممتاز اخبار ان کے کلام کے منتظر رہتے تھے، اور مدحیہ نوٹ کے ساتھ اسے شائع کرتے، انکی شاعری کی نسبت اخبار دمدمہ کلکتہ لکھتا ہے،

"واضح باد کہ ما سابق بریں چنان انگاشتہ بودیم کہ دریں زمان ناپرسان ہم چون شعرائے متقدمین در فصاحت و فضیلت کم ترکسے موجود لیکن السابقون السابقون اولٰئک ہم المقربون" در متاخرین در برابر سابقین دورے ہم پیدا نیست، سیما دریں دیار یافتہ شود، ولیکن معنی، فوق کل ذی علم علیم، ولم را ازیں خیالات باز داشتہ، وکذلک فضلنا بعضہم علی بعض زعم فاسد را از ضمیر ما خراشید، بعدہ بہ یقین دانستیم، کہ ملک خدائے تعالیٰ بہ این ہمہ وسعت کہ "ارض اللہ واسعۃ" از وجود این چنیں مردم عدیم الوجود، کہ در علم و ادب وخصائل کسب آراستہ باشد، خالی نیست، قصور عزلت گزینی ماست....

.... نام گرامی و اسم سامی جناب ظہیر الدین محمد رفیق الدولہ بہادر است"

اس کے بعد ان کی کتابوں کا ذکر اور ان کی شاعری پر اظہارِ رائے کیا ہے،

تصانیف مختلف موضوعوں پر حضرت ظہیر کی تصانیف ہیں جن سے ان کی وسعتِ نظر کا اندازہ ہوتا ہے، جو تصانیف مل سکیں، ان کے نام یہ ہیں،

ظہیر الایمان، ظہیر آلان، ظہیر الاسلام، محاسبہ النفس، معالجۃ النفس، مشاہد الحق، ظہیر الانشا، معرفت النفس، معرفت الروح، ماہیت الغناء، وسیلۃ الرزق، ماہیت البلاد، دستور المحبت، اسرار حکمت، اسرار غفلت، اسرار کربلا، اسرار نبوت، ہدایت الہنود، تقویت الاسلام، اسرار واجدی، رسالہ قضا و قدر، ترغیب الفرقان، سراج النبوت، مرثیہ جانی، مرثیہ وہبی، دیوان فارسی،

فارسی دیوان فارسی کے دیوان میں مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے، قصیدوں سے

عربی زبان میں درک کا پتہ چلتا ہے، غزلیات اکثر اساتذہ کی مشہور غزلوں پر لکھی ہیں، تصوف میں حافظ کا تتبع کیا ہے، اور ان ہی کے رنگ سے متاثر ہوئے ہیں، عام شاعری میں نظیری نیشاپوری کا رنگ جھلکتا ہے، وہی عشق و محبت کے جذبات کی شدت، اور وہی تخیل کی بلند پروازی ذیل کے انتخاب سے ان کی شاعری کا اندازہ زیادہ بہتر کیا جاسکتا ہے۔

اے نام تو سرنامۂ دیوان تعالیٰ   نام تو بود نام خدا از ہمہ بالا

چو آمدم می پرد ہر لحظہ چشم از شوق روئے تو   مگر از رنگ ما آموخت انداز پریدن ہا

نوحہ ام در سینۂ آتش زد ز چشم آب ریخت   آہ من دارد عجائب مختلف تاثیر را

اشک حسرت شمع می ریزد ز اشک چشم من   داغ دل گردید سوز سینہ ام پروانہ را

دامن کشاں چو بر سر خاکم گذر کند   دستے زند بدامن جانان غبار ما

ز حیرت شود محو حسن خودش   چو آئینہ رو بیند آئینہ را

آب گردید گرد مردم چشم   کشتی چشم رفت در گرداب

گفتم بیا، گفتا کجا، گفتم بہ بر گفتا چرا   گفتم پئے تسکین دل گفتا دلت بار من است

گفتم کہ باشد یار تو گفت کہ بخت من بود   گفتم ظہیر خستہ دل، گفتا کہ بیمار من ست

گفتم چہ دام جان و دل گفتا کہ زلف دلکشم   گفتم کدامی دانہ گفت این خال رخسار من ست

گفتم کہ بلبل در قفس، گفتا دل عاشق بہ تن   گفتم کہ گل در بوستان گفتا کہ رخسار من است

زلفش نہ بود دو ز شمع رخ او،   از پاس ادب سوے قدم مائل شد

دیدم چو حبیب را ندیدم خود را   ہشیاری دل بہ ہیں ز خود غافل شد

جان بدارم تا کنم بر تو نثار اے جان من   آمدی چوں بر مزارم شرمسارم بعد مرگ

بیقرارم آن قدر از درد ہجراں اے ظہیر   در لحد ہرگز نمی آید قرارم بعد مرگ

سوزش پروانہ کے باشد ز عشق   بلکہ می سوزد ز رشک داغ ما

بد حال گشتہ حال دل پر ملال ما   باشد مگر مجال ترحم بحال ما

در خواب ہم نمی گذرم در خیال او   ہست این خیال ہمچو خیال محال ما

بہر کار اول نگر راست و چپ   بباید کہ داری نظر راست و چپ

ز خود رفتہ انداز یمین و یسار   کند نعرۂ ما اثر راست و چپ

کسے را قضا در جہاں برنداشت   نہ بیند قضا و قدر راست و چپ

بحق واصل بشدم در شادی وصل   ظہیر این وصل باشد یا وصال است

کس حقیقت کسے مجاز گزید   فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

کار من از دست دوست از کار رفت   وا دریغا عمر من بیکار رفت

بود ز اہل سخن در جہان سخن باقی   قضا اگرچہ بسے را ازیں میاں برداشت

جاے نہ مکانے تو، ہر جاست مکانت   ہر منزل و ہر خانہ مکان ست و مکاں نیست

اگرچہ خاک من بر باد داری   ہنوز از مشت خاک من غبار ست

یار من در کنار آمد و رفت   جان درین جسم زار آمد و رفت

گر کنم اختیار ضبط من ،   آہ بے اختیار را چہ علاج

مکن عمارت عالی درین جہاں تعمیر   چرا کہ خاک شود و منقلب کنی گر کاخ

چو چشم مرا کرد بیمار خود   بگفتم تو ہم نیز بیمار باش،

چو بیہوش کردن مرا بے سبب   ز بیہوشی ما تو ہشیار باش،

چوں کشیدیم بہ آغوش خیال   رنگ رویش ز نزاکت شد فق،

مرحبا اے انیس تنہائی   کس نشد مونسم سواے فراق

کوفت دست اجل چو کوس رحیل | بر نیامد بجز صدائے فراق

بسکہ خون بیگناہان گشت دامنگیر چرخ | ہر سحر رنگ شفق گردد نمایاں بر فلک

گفت گر مخفی ز چشم مردماں آیم شبے | خاک من در خانہ ات باشد بگفتم بچشم

بقید زندگی از زندگی تنگم اجل باشد | بمدت در ہمیں زندان گرفتارم گرفتارم

زقید ہر دو عالم اے ظہیر آزاد گردیدم | کہ من قیدی بے قیدان گرفتارم گرفتارم

چودہویں صدی کی تفسیر کبیر

تفسیر جواہر

مصر کے مشہور عالم شیخ طنطاوی جوہری نے تفسیر جواہر کے نام سے پچیس جلدوں میں قرآن مجید کی تفسیر لکھی ہے، جو اپنی نوعیت اور معنوی محاسن کے لحاظ سے زمانہ حال کی تفسیروں مین یگانہ حیثیت رکھتی ہے، اسمیں شیخ موصوف نے جہاں سیاست، اقتصاد، فلسفہ و سائنس، فلکیات، طبقات الارض وغیرہ عصری علوم پر قرآن پاک کی آیتوں سے استشہاد کیا ہے، وہاں سلف کی تفسیر کی بھی پوری پوری پابندی کی ہے، ابھی اسکی پہلی جلد کا ترجمہ نہایت سلیس، عام فہم، ہندوستانی زبان میں کیا گیا ہے، جو صرف سورۂ بقر کی تفسیر پر مشتمل ہے، شروع میں علامہ سید سلیمان ندوی کا بصیرت افروز مقدمہ بھی ہے، مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ، کاغذ سفید ولایتی ۲۸ پونڈ، اور کتابت و طباعت دیدہ زیب ضخامت ۷۵۰ صفحے قیمت ہے علاوہ محصول ملنے کا پتہ :- سکریٹری عمر لائبریری عمرآباد متصل آمبور ضلع شمالی ارکاٹ

"صوبہ مدراس"

تلخیص و تبصرہ

فلسفہ کی کانگرس
کا
سالانہ اجلاس

دسمبر کا آخری ہفتہ اپنے علمی جلسوں اور کانفرنسون کے لئے مشہور ہے، اس سال ہندوستان کی فلسفیانہ مجلس کا چودھواں اجلاس الہ آباد میں ہوا مجلس استقبالیہ کے صدر الہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے، انھوں نے معزز مہمانوں کا خیر مقدم کیا، اور کہا کہ فلسفیوں کے ایک گروہ کا ایک جلسہ میں بیٹھکر خدا، تقدیر اور قوت ارادی وغیرہ جیسے مسئلوں پر گفتگو کرنا بظاہر ایسے ہی مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے، جیسے روم جب جل کر خاکستر ہو رہا تھا، تو سنیکا کا ایک شاگرد اپنی بانسری بجانے میں مصروف تھا، لیکن یہ ایک حقیقت ہے، کہ افراد ہی کے اخلاق حسنہ سے ریاست کی تعمیر ہوتی ہے، اور صرف فلسفیوں کی جماعت ہی اخلاق حسنہ کے اصول بنا سکتی ہے، بلکہ موجودہ حالات تو یہ چاہتے ہیں، کہ اس وقت ہر جگہ فلسفی ہی حکمراں ہوتے یعنی طاقت و اقتدار کے ساتھ سچائی کی پرستش ہوتی اور اس پر عمل بھی ہوتا، اس کے بعد انھوں نے کہا کہ بظاہر فلسفہ اور مذہب میں تضاد معلوم ہوتا ہے لیکن بیکن کا قول ہے کہ فلسفہ کا سطحی علم دہریت اور گہرا علم مذہب کی عقیدت پیدا کرتا ہے، فلسفہ ایک خشک چیز بھی نہیں، ملٹن کہا کرتا تھا کہ وجدانی فلسفہ کبھی مشکل اور غامض نہیں ہوتا ہے، بلکہ اپالو کی بانسری کی طرح شیرین اور موسیقی سے بھرا ہوتا ہے، ادب کا فلسفہ سے گہرا تعلق ظاہر ہے، سنسکرت میں سینکڑوں ضرب المثلیں اور کہاوتیں ایسی ہیں، جو فلسفیانہ حقائق و معارف کی تشریح کرتی ہین

انگریزی میں شکسپیر کے ڈراموں میں اخلاق، سچائی، نیکی اور معصومیت کے مختلف پہلوؤں کے بہترین نمونے ہیں، اردو میں غالب اور انیس کی شاعری میں فلسفیانہ نکتے کثرت سے ملیں گے، اقبال کا تو ذکر ہی نہیں، کولرج کہا کرتا تھا، کہ ایک آدمی اس وقت تک بڑا شاعر نہیں ہوسکتا، جب تک وہ فلسفی نہ ہو، شاعروں ہی پر کیا منحصر ہے، ہر بڑا آدمی فلسفی ہوتا ہے، یورپ کے آمر جمہوریت کے علمبردار، ترقی پسند ادب کے ادیب حتیٰ کہ دہشت انگیزی اور نراجی کے حامی بھی فلسفی ہیں، ایک فرانسیسی بذلہ سنج نے کہا ہے کہ فلسفہ کو مضحکہ خیز بتانے والے بھی دراصل فلسفی ہیں، سسرو کا قول ہے کہ دنیا میں کوئی ایسی مضحکہ خیز چیز نہیں ہے، جو کسی نہ کسی فلسفہ نے نہ کہی ہو،

اس کے بعد جلسہ کے صدر پادری سی، اف، انڈریوز نے اپنا خطبہ دیا، وہ فلسفی ہوں یا نہیں لیکن اہنسا کے قائل ہیں، اسلئے ان کے زبانی خطبہ کا یہی موضوع رہا، انھوں نے گوتم بدھ، زرتشت اور حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم کی روشنی میں دکھایا، کہ تشدد کا استیصال تشدد سے نہیں ہوسکتا، اور برائی برائی کے ذریعہ سے دبائی نہیں جاسکتی،

دوسرے روز فلسفہ کی مختلف شاخوں کے علحدہ علحدہ جلسے ہوئے، اسی روز ایک نشست میں فلسفہ اور تصوف کے باہمی ارتباط پر ایک دلچسپ مذاکرہ ہوا،

"منطق اور مابعد الطبعیات" کے اجلاس میں انڈھیرا یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر پی، ٹی راجو نے صدارت کی، ان کے خطبہ کا موضوع "فوق المرتبہ کا تخیل اور دماغ کا حلقۂ اثر تھا" اس میں انھوں نے یہ بتایا کہ فلسفیانہ تفسیر جدید تخیلات کی تشکیل سے متعلق ہوتی ہے، تاکہ وجود اور زندگیوں کی پیچیدگیوں پر قابو حاصل ہو، وجود کا معیار جتنا ہی بلند ہوتا جاتا ہے، اتنے ہی تخیلات ناقص ہوتے جاتے ہیں اور نئے نئے نظریے اور خیالات پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، ڈاکٹر موصوف نے اس بحث کو پھیلاتے ہوئے آخر میں کہا کہ اگر دماغ ایک وجود حقیقی ہے جس سے عمل صادر ہوتا ہے، تو عمل کو

فوق المرتبہ کا فعل سمجھنا چاہئے،

"ہندوستانی فلسفہ" کے اجلاس کی صدارت کلکتہ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر ایس سی چٹرجی نے کی، ان کے خطبہ کا موضوع "فلسفہ اور ہندوستانی نقطۂ نظر تھا" اس میں تجزیہ کرکے بتایا ہے کہ ہندستانی فلسفہ ظواہر کے بجائے حقائق سے بحث کرتا ہے، اس میں علم کے معنی محض ذہنی ادراک نہیں، بلکہ سچائی سے براہ راست تجربہ حاصل کرنا ہے، اس کی تکمیل محض استدلال سے نہیں، بلکہ تجربہ کے عقلی مطالعہ سے ہوتی ہے، اور یہ اخلاق کے تقدس اور پیہم غور و فکر سے حاصل ہوتا ہے،

اس کانگریس کے اس اجلاس کی ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ اسی سال اس میں اسلامی فلسفہ کی بھی ایک شاخ بڑھائی گئی ہے، اس کے صدر جامعہ عثمانیہ کے پروفیسر خلیفہ عبدالحکیم تھے، انھوں نے اپنے خطبہ میں فرمایا کہ اسلامی فلسفہ ایک ذہنی عمارت ہے، جو اسلام کی بنیاد پر کھڑی کی گئی ہے، یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ اسلام کا آغاز کسی مابعد الطبعیاتی عقیدہ کی حیثیت سے نہیں ہوا، اور نہ اس کے پیغمبر اور ان کے خلفاء موجودہ معنوں میں فلسفی تھے، اسلام ایک اخلاقی اور عمرانی انقلاب لیکر آیا، اس کے ذریعہ سے کوئی جدید مابعد الطبعیات پیدا نہیں ہوا، البتہ زندگی کے جدید نقطہ ہائے نظر ضرور پیدا ہوئے، اسلامی فلسفہ محض اسلام کے مذہب کا فلسفہ ہے، اور اسلامی اخلاق مذہب اسلام کے فلسفہ کا ضروری جز ہے، پروفیسر موصوف نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا، کہ اب تک ہندوستان کی کسی یونیورسٹی میں اس کے مطالعہ اور تحقیق کے لئے مناسب صورتیں اختیار نہیں کی گئی ہیں، مگر اس کی اہمیت کا تقاضا یہ ہے کہ مختلف یونیورسٹیوں میں لائق اساتذہ کی زیر نگرانی اسکے لئے جلد از جلد شعبے کھولے جائیں،

ہندو کالج دہلی کے ڈاکٹر اندراسین نے شعبۂ نفسیات کی صدارت کی، انھوں نے اپنے خطبہ میں کہا کہ ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے، جہاں کلچر کے نفسیات اور فلسفہ پر بہترین طریقہ سے

مطالعہ کیا جا سکتا ہے، کیونکہ یہاں ہر قسم کے کلچر اور مذاہب موجود ہیں، لیکن اب تک ہم ان کی ط
سے غافل رہے ہیں، اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ماہرین نفسیات اس کی طرف متوجہ ہوں
یونیورسٹیوں میں ہندوستان کے مختلف کلچر کے نفسیاتی مطالعہ کے لیے سہولتیں پیدا کی جائیں
اس سے بہت ممکن ہے کہ مختلف کلچرل فرقے کے تعلقات خوشگوار ہو جائیں،

کوکناڈا کے مشہور بیرسٹر مسٹر رنگا چاری نے "اخلاق اور معاشرتی فلسفہ" کے شعبہ کی صدا
کی، ان کے خیال کے مطابق گاندھی جی کا فلسفۂ زندگی ایک بہترین نصب العین ہے،

اس کانگریس میں ایک روز سی اف اینڈریوز نے "ہندوستان کی مشترکہ زبان" پر ایک تقر
بھی کی، انھوں نے ہندوستان کے لئے ایک مشترکہ زبان کا ہونا ضروری قرار دیا، اس کیلئے ہند
کی حمایت کی، مگر ان کی رائے ہے، کہ یہ مشترکہ زبان محض کاروبار اور بول چال کے لئے ہو، ا
علمی کاموں کے لئے مختلف زبانیں بہرحال محفوظ رہیں، اور ذریعۂ تعلیم صوبہ کی زبانیں ہوں، جہاں
تک رسم الخط کا تعلق ہے، ہندوستانی زبان تو لاطینی حروف میں ہو، لیکن ہر علمی زبان کیلئے
اپنا اپنا رسم الخط ہو۔

"ص، ع"

ادارۂ معارف اسلامیہ کا دہلی میں اجلاس

ادارۂ معارف اسلامیہ کا اجلاس ۲۶، ۲۷، ۲۸ دسمبر ۱۹۳۸ء کو دہلی کے اینگلو عربک کالج میں منعق
ہوا، استقبالیہ کے صدر آنریبل ڈاکٹر سر محمد عبد الرحمٰن، اور اجلاس کے صدر ڈاکٹر سر شاہ سلیمان تھے، با
سے آنے والے مہمانوں کی تعداد تیس پینتیس کے قریب تھی، یہ لاہور، حیدرآباد، کاٹھیاواڑ، علی گڈھ، رامپ
اعظم گڈہ، اور دوسرے شہروں سے آئے تھے، شہر کے اہل علم بھی جلسہ میں شریک تھے، پہلا جلسہ ۲۶
دسمبر کو ۱۰ بجے دن کے شروع ہوا، پہلے صدر استقبالیہ نے اپنا خطبہ پڑھا، جس میں مہمانوں کے خیر مقد

کی، اردو زبان کی اہمیت، ضرورت، اور دلی سے اس کے خاص تعلقات کی تفصیل کی گئی تھی، اور آخر
میں ہندو مسلمانوں میں باہمی رواداری کی اپیل کی گئی تھی،

اس کے بعد صدر اجلاس ڈاکٹر سر شاہ سلیمان نے اپنا فاضلانہ خطبہ پڑھا، خطبہ گو انگریزی میں
چھپا ہوا تھا، مگر موصوف نے اس موقع پر تقریر اردو میں فرمائی، تقریر کا اصل موضوع مسلمانوں میں
علم کی غرض و غایت تھا، اس کے بعد انھوں نے یورپ کے نئے علوم و فنون کو اردو میں اور اسلامی
علوم و فنون اور تحقیقات کے نتائج کو یورپ کی زبانوں میں منتقل کرنے پر زور دیا،

ان تقریروں کے بعد صدر محترم نے ادارہ کی علمی نمائش کا افتتاح کیا، ادارہ کی دوسری نشست
اسی دن ۲ بجے شروع ہوئی، شمس العلماء مولینا عبد الرحمٰن صاحب پروفیسر عربی دلی یونیورسٹی جلسہ
کے صدر تھے، مولینا عبد العزیز صاحب میمن پروفیسر عربی علیگڈھ مسلم یونیورسٹی نے اپنا مضمون عربی میں
پڑھکر سنایا، مضمون کا عنوان "حجاز اور تہامہ کے جغرافیہ پر سب سے پہلی تالیف" تھا، دوسرا مضمون مولوی
عبد السلام صاحب رامپوری نے ابو ہلال عسکری کی کتاب الاوائل پر پڑھا، پروفیسر موسوی اینگلو عربک
کالج دلی کا مضمون "اعتماد الدولہ" اور خواجہ عبد المجید دہلی کا "صوفی اور تصوف" پر تھا،

بقیہ اجلاسوں کے مضامین کے عنوانات پروگرام کے مطابق حسب ذیل ہیں، ان میں سے
بعض اصحاب تشریف نہ لا سکے تھے، اس لئے اُن کے مضامین پڑھے نہ جا سکے، بہرحال مضامین
اور ان کے لکھنے والوں کے نام یہ ہیں،

۱۔ ڈاکٹر ہادی حسن کا لکچر "فارسی اخلاق کے چند پہلو"
۲۔ ڈاکٹر زبیر صدیقی، کلکتہ یونیورسٹی "عربی شعر و نقد شعر"
۳۔ پروفیسر عندلیب شادانی ڈھاکہ یونیورسٹی، "رباعیات ابو سعید بن ابی الخیر کا مصنف"
۴۔ ڈاکٹر نبیر محمد حسن لاہور "شہرزوری کی نزہتہ الارواح"

۵۔ پروفیسر سخاء اللہ پشاور "اسلامیہ کالج پشاور کی چند اہم قلمی کتابیں"

۶۔ پروفیسر شیرانی لاہور "چند نئی ریختہ نظمیں"

۷۔ قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی، "عہد اسلامی میں کتب خانوں کا نظم ونسق"،

۸۔ مولوی امتیاز علی خانصاحب عرشی، "ابن حزم ظاہری کی جمہرۃ النسب"

۹۔ پروفیسر غلام جیلانی برق، ایم اے، ہوشیار پور "علامہ احمد ابن تیمیہ"

۱۰۔ پروفیسر محفوظ الحق کلکتہ "فتوحات مکیہ کا ایک نایاب نسخہ"

۱۱۔ پروفیسر ڈاکٹر اظہر علی دہلی "اکبر کی وفات"

۱۲۔ مولنیا محمد ادریس صاحب ندوۃ المصنفین دہلی "آذر"،

۱۳۔ ڈاکٹر قریشی لاہور، اسلامی مدرسوں میں عربی کی تعلیم،

۱۴۔ ڈاکٹر حسین ہمدانی بمبئی، "لواح المؤید فی الدین الشیرازی"،

۱۵۔ ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ ملتان "اسلام کے ازمنۂ وسطی میں موازنہ مذاہب"،

۱۶۔ آغا عبدالستار ایم اے لاہور، "آتش کے زمانہ کا شاعر تاج رضا"،

۱۷۔ پروفیسر حمید علی راٹھور، ایم اے، سیالکوٹ "خواجو بحیثیت غزل گو شاعر کے"،

۱۸۔ پروفیسر محمد اقبال لاہور، "غزنوی عہد کی فارسی شاعری کے کچھ خصوصیات"

۱۹۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد حسین نینار مدراس، "عربوں کا بلہرا"

۲۰۔ آغا محمد اشرف ایم اے، ڈیرہ دون اسکول، "ایران حاضر"

۲۱۔ ڈاکٹر سر شاہ سلیمان "اضافیت جدید"

۲۲۔ ڈاکٹر کوٹھاری، ایم اے پی ایچ ڈی، "سائنس میں مسلمانوں کا حصہ"،

۲۳۔ ڈاکٹر رام بہاری ایم اے پی ایچ ڈی، "ریاضیات میں مسلمانوں کا حصہ"

۲۴۔ پروفیسر ڈاکٹر شجاع منعمی بھاولپور "کمال الدین ابوالحسن فارسی کے نظریہ کے مطابق عکس نور کا نظریہ"،

۲۵۔ پروفیسر عبدالباسط ایم اے لاہور، "اونبا العرب"

۲۶۔ ڈاکٹر عبداللطیف، حیدرآباد، "خلافت کا ماضی اور مستقبل"

۲۷۔ ڈاکٹر زبید احمد الہ آباد، "ہندوستان کی تصانیف عربیہ متعلق علوم حدیث"،

۲۸۔ پرنسپل محمد شفیع "سرو کشمیر"،

۲۹۔ پنڈت لکشمی دھار، "ہندی ادب میں تصوف اور مسلمان"

۳۰۔ مولوی عبدالخالق صاحب دہلی، "مسائل نافع بن الازرق عن عبداللہ بن عباسؓ"،

۳۱۔ ڈاکٹر نظام الدین حیدرآباد، "قدیم فارسی ادبیات کی چند خصوصیتیں"،

۳۲۔ ڈاکٹر ہری رام شرما، ایم اے پی ایچ ڈی، لاہور "احمد شاہ ابدالی کا آٹھواں حملہ ہندوستان پر"

۳۳۔ سید سلیمان ندوی، "قنوج اور سندھ"

۳۴۔ شاہ معین الدین احمد ندوی رفیق دارالمصنفین، "عربی لغات کے عرب مدونین"،

۳۵۔ ڈاکٹر مولوی عبداللہ چغتائی، "ابتدائی ہندی اسلامی تعمیرات"،

۳۶۔ شمس العلماء مولینا عبدالرحمن دہلی "پروفیسر مارگولیتھ کے نظریہ عربی شاعری کی اصلیت وتاریخ پر تبصرہ"،

۷ر کی شام کو اردو مشاعرہ ترتیب پایا تھا،

علمی نمائش میں قلمی کتابوں خطاطی کے مختلف نمونوں، وصلیوں کتبوں، اور اسلامی سکوں کا اچھا خاصہ ذخیرہ تھا، جو حسب معمول پروفیسر شیرانی اور مولوی عبداللہ صاحب چغتائی کی محنتوں کا نتیجہ تھا،

اس اجلاس میں حسب ذیل ریزولیشن پاس ہوئے،

۱۔ ادارۂ معارفِ اسلامیہ گذشتہ اجلاس لاہور کی قرارداد کا اعادہ کرتا ہے، جس میں محکمۂ آثارِ قدیمہ کی توجہ عربی فارسی کتبات کے تحفظ اور اشاعت کی طرف منعطف کی گئی تھی، ادارہ کو افسوس ہے کہ ان امور کی طرف وہ توجہ اب تک مبذول نہیں کی گئی، جو ہونی چاہیئے تھی،

۲۔ ادارۂ معارفِ اسلامیہ کی رائے میں یہ ضروری ہی کہ کم از کم شمالی ہند کی یونیورسٹیوں میں جہاں تک جلد ممکن ہو ثانوی مدارس اور انٹرمیڈیٹ کے درجوں میں اردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا جائے

۳۔ ادارۂ معارفِ اسلامیہ دہلی کے اربابِ فضل سے توقع کرتا ہی کہ وہ متحدہ کوشش سی اس قدیم دارالعلم کی شان کے مطابق معارفِ اسلامیہ سی متعلق مخطوطات کا ایک مرکزی کتبخانہ قائم کرنے کی سعی فرمائیں، ادارہ اینگلو عربک کالج دہلی کی مجلسِ منتظمہ اور اولڈ بوائز ایسوسی ایشن سے درخواست کرتا ہی کہ وہ اس بارے میں ضروری اقدام کریں،

۴۔ ادارۂ معارفِ اسلامیہ اربابِ علم کی خدمت میں قدیم عربی فارسی اور اردو کتب کی نشر و اشاعت کی طرف توجہ دینے کی درخواست کرتا ہے، ہمارے اسلاف کے یہ کارنامے ایک قیمتی ورثے کی حیثیت رکھتے ہیں، جسکی حفاظت ہمارا مقدس فرض ہی، جملہ مسلمان ایسی مطبوعہ کتابوں کی خریداری سی ان کی نشر و اشاعت میں مدد دیسکتے ہیں، اور طابعین اور ناشرین کو اشاعت کی مالی مشکلات سے نجات دے سکتے ہیں،

۵۔ ادارۂ معارفِ اسلامیہ کا یہ اجلاس پر زور الفاظ میں ذمہ دار مجالسِ منتظمہ کی خدمت میں درخواست کرتا ہی کہ عربک کالج دہلی میں عربی فارسی اور اردو کی تعلیم کا زیادہ سی زیادہ اہتمام کیا جائے جو اسکی سابقہ عظمت اور دہلی کی موجودہ ضروریات کے مطابق ہو،

۶۔ ادارۂ معارفِ اسلامیہ کا یہ اجلاس تجویز کرتا ہی کہ ادارہ کی ایک شاخ دہلی میں قائم کیجائے تاکہ وہ ادارہ کے مقاصد کو کامیاب بنانے میں ادارہ کی مجلس عاملہ کی مدد کرے،

اخبارِ علمیہ

دنیا کی بربادی

طبعیات اور نجوم کے بعض ماہروں کا قیاس ہے کہ فطرت کے قوانین کے ذریعے دنیا کی بربادی خود بخود ہو سکتی ہے، مثلاً یہ ممکن ہے کہ آفتاب گرنے والے ستاروں کی طرح بھڑک اُٹھے جس سے اسمین اتنی حدت اور روشنی بڑھ جائے کہ زمین اور اس پر بسنے والے سب جل کر راکھ ہو جائیں، یہ بھی ہو سکتا ہی کہ چاند زمین کے گرد چکر کرتے ہوئے اس سے اتنا نزدیک آجائے کہ سمندر میں ہلاکت خیز تلاطم برپا ہونے لگے، اور چاند ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زمین پر گر جائے، ایک پرانا خیال یہ تھا کہ آفتاب دہکتے ہوئے کوئلہ کی طرح آخر میں اتنا سرد ہو جائے گا، کہ زمین پر مخلوقات کی زندگی کی بقا ناممکن ہو جائیگی، لیکن واشنگٹن یونیورسٹی کے ایک ماہر طبعیات کی تحقیق یہ ہے، کہ آفتاب سرد ہونے سے پہلے بہت زیادہ گرم ہو جائے گا، اسی سلسلہ میں آج کل سائنس والوں میں ایک نیا نظریہ مقبول ہو رہا ہے، وہ یہ کہ آفتاب کی شعاعوں کے ہائڈروجن وزنی اجزاء خصوصاً ہیلیم میں منتقل ہو جاتے ہیں، آئنسٹائن کے نظریہ کے مطابق یہ منفعل شدہ اجزاء کے ذرات کا کچھ حصہ قوت میں تبدیل ہو جاتا ہی، اس طرح آفتاب کا ہائڈروجن اس سے برابر خالی ہوتا جا رہا ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حساب لگایا گیا ہے، کہ ہائڈروجن کے نکلنے سے دوسرا ہائڈروجن بڑی تیزی سے اور زیادہ مقدار میں بن جاتا ہی جس سے آفتاب نسبتۃً زیادہ گرم اور روشن ہو جاتا ہی، مثلاً آفتاب سے ہائڈروجن ایک فی صدی نکل جائے گا، تو آفتاب سے گنا

زیادہ روشن ہو جائے گا، آخر میں آفتاب میں اتنی گرمی اور روشنی پیدا ہو جائیگی، کہ اسکی ساری چیزیں جل کر راکھ ہو جائیں گی، لیکن ماہرین طبعیات کا خیال ہے، کہ اس مدت کو آتے آتے کئی کھرب سال لگیں گے۔

طبعیّات کا نوبل انعام

۳۸ء میں طبعیات میں نوبل پرائز روم یونیورسٹی کے پروفیسر انریکو فرمی کو ملا ہے، پروفیسر موصوف کا سن ابھی صرف ۳۷ سال کا ہے، ذرات میں سب سے وزنی ذرہ یورینیم سمجھا جاتا تھا، یہ ایک سفید دھات کی قسم کا عنصر ہے، جو رال وغیرہ میں پایا جاتا ہے، پروفیسر مذکور کی تحقیقات نے یہ ظاہر کیا ہے، کہ یورینیم سے بھی زیادہ وزنی ذرہ موجود ہے، اس اکتشاف کے لئے اس نے یورینیم کے اندر نیوٹرون کو داخل کیا، جس سے ایک ایسا عنصر پیدا ہوا جو ذرہ میں رہا، لیکن یورینیم سے زیادہ وزنی تھا، ڈاکٹر فرمی نے اس قسم کے کئی اور ذرے دریافت کئے ہیں،

ایک نئی مشین کی ایجاد

کلیفورنیا کے ایک انجنیر نے سمندر کی تہ سے دھات اور دوسری چیزوں کو باہر نکالنے کیلئے ایک عجیب و غریب مشین ایجاد کی ہے، انجنیر مذکور کو سمندر کو مختلف قسموں کے دھاتوں کا خزانہ بلکہ زندگی کی ماں سمجھتا ہے، گذشتہ جنگ عظیم میں اس نے اپنی انجنیرنگ کے سلسلہ میں مختلف محاذوں پر کام کئے تھے جنگ کے دوران میں بحر منجمد میں انفلوئنزا کی وبا پھیل گئی، اس کو فکر ہوئی، کہ آخر یہ انفلوئنزا سمندر میں کیوں پھیلا، ؟ تحقیق کے لئے وہ سمندر کے پانی کے نمونے جمع کرنے لگا، اسکی تہ سے پانی نکالنے کیلئے اس نے ایک ایسا ڈول بنانا چاہا جس کا منہ سمندر کی گہرائی میں جا کر مضبوطی سے بند ہو جائے، اس ایجاد میں اسکی دلچسپی اتنی بڑھی، کہ وہ انفلوئنزا کی تحقیق کو تو فراموش کر گیا، اور

مسلسل بیس برس تک اس ڈول کی ایجاد میں لگا رہا، ابھی کچھ روز ہوئے کہ اس نے اپنی کامیابی کا اعلان کیا ہے، اسکی ایجاد کی ہوئی مشین سمندر میں ایک ہزار فیٹ تک اندر جاتی ہے، جہاں اس میں نیچے کی چیزیں کثرت سے بھر جاتی ہیں، اور پھر مشین کا منہ اس طرح بھر جاتا ہے، کہ ساری چیزیں نیچے سے اوپر محفوظ چلی آتی ہیں، انجنیر مذکور کا خیال ہے، کہ اس مشین کے ذریعہ سے سمندر کی تہ سے سونا آسانی سے دستیاب ہو سکیگا، الاسکا کے ساحل کے پاس سمندر میں سونے کی کانیں دریافت ہوئی ہیں، وہاں یہ مشین مفید ثابت ہوگی، نہ صرف تجارتی اغراض بلکہ سائنٹفک تحقیقات کیلئے بھی یہ بہت ہی کارآمد ہے،

ممالک متحدہ امریکہ کے گریجویٹ کی پریشانی (!)

ممالک متحدہ امریکہ کے گریجویٹ عام کساد بازاری کے شاکی ہیں، چنانچہ وہاں کے باشندوں کی دلچسپی اعلیٰ تعلیم سے کم ہو رہی ہے، وہاں کی یونیورسٹیوں کے چند استادوں نے مل کر ۲۸ء سے ۳۶ء تک کے اعداد وشمار پر غور و فکر کیا تو اس نتیجہ پر پہونچے، کہ اعلیٰ تعلیم اقتصادی کساد بازاری کو دور کرنے میں معاون اور نہ ملازمت دلانیکی ضامن ہو سکتی ہے، انکی تحقیقات ہے کہ ۲۹ء سے پہلے ۹۰ فی صدی گریجویٹ برسر روزگار ہو جاتے تھے، ۳۲ء میں صرف ۶۵ فی صدی مرد گریجویٹ اور ۵۲ فی صدی عورتوں کو تلاش ملی، انجنیروں وکیلوں اور استادوں کو تلاش روزگار میں بڑی دقتیں ہوئیں، ان میں سے جن کو نوکریاں ملیں ایک بڑی تعداد نے مجبوراً دوسرا پیشہ اختیار کیا، جس کے لئے انھوں نے تعلیم نہیں حاصل کی تھی، اور ایک گریجویٹ کو جو تنخواہ عموماً ملتی تھی، اس سے بہت کم ملنے لگی، ۲۸ء میں ان کو ۱۹۰۰ ڈالر سالانہ ملتے تھے، لیکن ۳۲ء میں ۱۲۰۰ ڈالر، اور عورتوں کو اس سے بہت کم ملے ۳۶ء میں ایک گریجویٹ کو روزگار ملنے میں دقت باقی نہیں رہی، لیکن ان کی تنخواہیں صرف ۱۳۵۰ ڈالر تک رہیں جو ۲۸ء سے نسبتہً کم تھیں، ان استادوں کا خیال ہے، کہ پھر بھی اگر جنگ یا غیر معمولی کساد بازاری

شروع نہیں ہوئی، تو ایک گریجویٹ اپنی تعلیم ختم کرنے کے آٹھ سال کے بعد ۲۰۰۰ سے ۳۰۰۰ ڈالر کم
ضرور حاصل کر سکتا ہے، (ایک ڈالر قریب قریب تین روپئے کے برابر ہوتا ہے)

ایک نفسیاتی تجزیہ

مچگین کا ایک شہری نو بچوں کا باپ تھا، لیکن وہ اپنی بیوی اور بچوں کی طرف کبھی مائل نہ ہوا، بلکہ وہ ہمیشہ ان کے ساتھ جھڑکی سختی اور غصہ سے پیش آتا تھا، اس کے چھوٹے بچے کو مچگین کے حاکموں نے باپ سے لیکر لڑکوں کی ایک پرورش گاہ میں داخل کر دیا، وہ کچھ بڑا ہوا تو ایک متمول بیوہ کے گھر میں رہنے لگا، تعلیم کیلئے اس کا نام ایک اسکول میں لکھوا دیا گیا، جہاں وہ پڑھنے لکھنے میں نمایاں رہا، لیکن اسکے عادات و اطوار پسندیدہ نہ تھے، متمول بیوہ اسکول کی صدر تھی، اسلئے وہ اسکول کے استادوں سے ہر قسم کی مراعات کا خواہاں رہتا تھا، ایک روز وہ اپنے درجہ میں سو رہا تھا، کہ استاد نے تمام لڑکوں کے سامنے اس کی سرزنش کی، اور اسکول سے نکال دیا، وہ فوراً گھر آیا، اور اپنی ماں کا پستول لے کر اسکول واپس گیا، جہاں استاد کے کمرہ میں گھس کر متواتر گولیاں چلائیں، وہ پکڑ لیا گیا، مگر جیل میں نہیں بھیجا گیا، بلکہ اس کو مچگین یونیورسٹی کے ماہرین نفسیات نے اپنے ادارہ میں چار ہفتے تک رکھا، اور اس کے ذہن و دماغ کا نفسیاتی تجزیہ کیا، آخر میں وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس کی تند اور تشدد پسند طبیعت والدین کی الفت و محبت سے محرومی اور گھر میں ضبط و نظم نہ ہونے کا نتیجہ ہے، "ص ع"

ادبیات

آہ مولانا شوکت علی

از یحییٰ اعظمی

اُف غمِ روزگار کی باتیں … دھرنا پائدار کی باتیں
جو رہے ایک دم قرار نہیں … آہ لیل و نہار کی باتیں
اس خزاں آشنا زمانہ میں … کیا سنائیں بہار کی باتیں
دل جو پہلو میں ہو تو اب سنئے … دیدۂ اشک بار کی باتیں
ہو گیا آہ آج وہ رخصت … یاد ہیں جس کی پیار کی باتیں
کس کو اب بیقرار کر دینگی … تمتِ دل فگار کی باتیں
کون ہے جو سنے گا اب یارو … اُمتِ سوگوار کی باتیں
قوم کو کون اب سکھائے گا … ہمتِ اُستوار کی باتیں
برق سے بڑھکے کام کرتی تھیں … شوکتِ نامدار کی باتیں
وہ زباں کیا تھی تیغِ جوہردار … جس میں تھیں ذوالفقار کی باتیں
تیغِ ابرو کے ہر اشارے میں … خنجرِ آبدار کی باتیں
تھیں سراپا پیامِ جوشِ جہاد … اس مجاہد شعار کی باتیں
تا ابد اشک خوں رلائیں گی … آہ شوکت کی پیار کی باتیں

کانپ اٹھتا تھا لشکرِ باطل آہ کوہِ وقار کی باتیں،

اب کہاں آہ شوکتِ ملت

آئینہ دارِ عظمتِ ملت

اب کہاں وہ وفا شعار افسوس خادمِ کعبہ صد ہزار افسوس

ہند سے لیکے تا بہ خاکِ حجاز غم میں کس کے ہے سوگوار افسوس

اٹھ گیا وہ مجاہدِ اعظم تھا جو اسلام پر نثار افسوس

اس بہادر سے ہو گئی خالی صفِ میدانِ کارزار افسوس

چل دیا چھوڑ کر غلاموں کو ملکِ ہمت کا تاجدار افسوس

آج خود شیرِ بیشۂ اسلام ہو گیا موت کا شکار افسوس

وہ زعیمِ فہیم اب نہ رہا جس سے تھا قوم کا وقار افسوس

دشمنوں سے مقابلہ کے لئے تھا وہ اک سدِ استوار افسوس

سرفروشانِ ملک و ملت کا مایۂ ناز و افتخار افسوس

مٹ گئی ہائے بزمِ دنیا سے آج جوہر کی یادگار افسوس

گلشنِ آرزوے ملت کی، خاک میں مل گئی بہار افسوس

شدتِ غم سے کیوں نہ ہو جائے دامنِ صبر تار تار افسوس

صدمہ و ابتلائے پیہم سے دلِ ملت ہے داغدار افسوس

ہیں ہرے آج زخمہائے جگر

آہ تازہ ہوا غمِ جوہر

اٹھ گیا وہ مجاہدِ اسلام حق ہے گر وقفِ غم ہیں مصر و شام

وہ مجاہد کہ زندگی جس کی، تھی سراپا جہاد کا پیغام

وہ اولوالعزم قائدِ ملت، جس سے تھی تازہ شوکتِ اسلام

وہ بہادر کہ ہر ادا جس کی، جرأت آموزِ صد دلِ ناکام

وہ وطن دوست جس نے پہنچایا گوشہ گوشہ میں حریت کا پیام

تھا وہی زیبِ مسندِ اسلاف تھا وہی آج جانشینِ عظام

اجمل و جوہر و تصدق کا اس کی ہستی پہ ہو گیا اتمام

آہ ہوتے ہیں اب کہاں پیدا ایسے عالی ہمم زعیمِ ہمام

عہدِ حاضر کے سرفروشوں میں اس مجاہد کا تھا بلند مقام

تھا وہ ملت کا قائدِ محبوب تھے فدا اس پہ سب خواص و عوام

روز و شب جد و جہدِ بے پایاں تھا یہی اس کی زندگی کا نظام

مرتے دم تک شکست دے نہ سکی اس کی ہمت کو گردشِ ایام

رشک ہے اس کی موت پر سب کو مرکے پائی ہے وہ حیاتِ دوام

رو لے جی بھر کے آج اے ملت کہ ہے یہ آب وداع کا ہنگام

اب وہ پیکر نظر نہ آئے گا، یونہی ہوتی رہیں گی صبح اور شام

تھکنے والے تجھے مبارک ہو، ابدی خوابگاہ کا آرام

تیری روحِ عظیم پر صدقے نعمتِ باغِ خلد کا انعام

ہو قبول اے مسافرِ جنت ہم غلاموں کا بھی درود و سلام

آج مختار و جوہر و اقبال

سبھی حاضر ہیں بہرِ استقبال

باب التقریظ والانتقاد

نئے رسالے

ریویو آف ریلیجنز، مرتبہ جناب علی محمد صاحب اجمیری، تقطیع اوسط، ضخامت ۴۸ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت سالانہ سے ر، طلبہ اور غیر احمدی اشخاص سے ۴؎، پتہ :- قادیان پنجاب،

ریویو آف ریلیجنز قادیانیوں کا بہت پرانا رسالہ ہے، ہمارے پاس حال میں ریویو کے لئے آیا ہے، اس کے چند پرچے ہماری نظر سے گذرے، قادیانی اخبارات ورسائل کی خصوصیات اوران کے مباحث معلوم ومشہور ہیں، یہی رنگ اس رسالہ کا ہے، یہ قادیانی جماعت کا تبلیغی رسالہ ہو، عموماً اسی قسم کی بحثیں ہوتی ہیں، لاہوری جماعت پر تنقید کا فرض بھی ادا کرتا ہے، بعض نمبروں میں کوئی خالص مذہبی مضمون بھی نظر آتا ہے، کبھی کبھی اسلام سے متعلق غیر مسلموں کے اعتراضات اوران کی غلط بیانیوں کی تردید وتنقید کے مضمون بھی اس میں ہوتے ہیں،

صور اسرافیل، مرتبہ جناب یلدرم صاحب یلدرم، تقطیع اوسط ضخامت ۴۸ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت سالانہ :- ۴؎، فی پرچہ ۵ ر، پتہ دفتر صور اسرافیل فیلنگ روڈ، لاہور،

یہ رسالہ لاہور سے نکلتا ہے، اس وقت تک اس کے کئی نمبر نکل چکے ہیں، علمی ادبی تاریخی

ہر ذوق کے مفید مضامین پیش کرتا ہے، ادب کیساتھ ملت کا بھی خدمت گذار ہے، عام معلومات کیلئے اچھا رسالہ ہے، لیکن اڈیٹر صاحب کی طرز انشا، کا دور مدت ہوئی کہ ختم ہوچکا، "صور اسرافیل" کی مناسبت کا تحریر میں قائم رکھنا ضروری نہیں ہے، اب تو زبان کو زیادہ سے زیادہ صاف سادہ اور آسان بنانے کی ضرورت ہے،

صہبا، مرتبہ جناب محمود قاسم صاحب میکش، تقطیع اوسط، ضخامت ۲۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت سالانہ ہے، ششماہی ۱۲؎، پتہ :- دفتر صہبا نمبر ۲ بی امرتلہ لین کلکتہ،

یہ ادبی رسالہ کلکتہ سے نکلتا ہے، بیشتر حصہ افسانوں کا ہوتا ہے، لیکن افسانوں کا معیار بلند اور ستھرا ہے، کوئی نمبر متعدد دلچسپ افسانوں سے خالی نہیں ہوتا، متعلقات ادب میں زبان کے متعلق مفید اور اچھی بحثیں ہوتی ہیں، معلومات کے اعتبار سے بھی کبھی کبھی کوئی سنجیدہ مضمون نظر آجاتا ہے، ادبیات کا حصہ بھی خاصہ ہے، ادبی لحاظ سے صہبا اچھے رسالوں میں شمار ہونے کے لائق ہے، کلکتہ جیسے مقام پر ایسے رسالہ کو زندہ رکھنے کی ضرورت ہے،

ہندستانی، مرتبہ جناب سہیل عظیم آبادی، تقطیع اوسط ضخامت ۴۸ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت :- سالانہ سے ر، فی پرچہ ۴ر، پتہ :- ہندوستانی پریس بانکی پور پٹنہ،

یہ رسالہ بہار کے نوجوان فسانہ نگار جناب سہیل عظیم آبادی کی ادارت میں نکلتا ہے، رسالہ ادبی ہے لیکن سیاست پر بھی اظہار خیال ہوتا ہے، بیشتر حصہ ادب وافسانوں کا ہوتا ہے کسی کسی نمبر میں کوئی دلچسپ اور سنجیدہ مضمون بھی نظر آجاتا ہے، خالدہ ادیب خانم کا مضمون "امتحان کی کٹھن گھڑیاں" دلچسپ ہے، اس رسالہ کا مقصد جیسا کہ اس کے نام اور زبان سے ظاہر ہوتا ہے، ہندو اور مسلمانوں کی مشترکہ ہندوستانی زبان کی اشاعت ہے، اسی لئے رسالہ کے لئے زبان آسان اختیار کیگئی ہے، نامانوس لفظوں اور ترکیبوں سے پرہیز کیا جاتا ہے، جہاں کوئی ایسا صاف لفظ نہیں ملتا، وہاں اردو اور ہندی دونوں کے ہم معنی

لفظ لکھ دئے جاتے ہیں لیکن کہیں کہیں اس میں بے اعتدالی بھی پائی جاتی ہے، جیسے سرمایہ داری کے لئے "پونجی شاہی" تحریک کے لئے "اندولن" سیاسی کے لئے "راج نیتک" اخلاق کے لئے "نیتکتا" تنظیم کے لئے "سنگٹھن" مستقبل کے لئے "بھوشیہ" تجویز کے لئے "پرستاؤ" وغیرہ بالکل اسی کے مقابل کہیں کہیں پر بے تکلف بلاکسی تشریح کے عربی اور فارسی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، اعتدال اور سلامت روی ہر چیز کے لئے بھی شرط ہے،

دلگداز، مرتبہ جناب نشتر جالندھری، تقطیع اوسط ضخامت ۸۰ صفحے، کاغذ بہتر، کتابت و طباعت معمولی، قیمت سالانہ :- عہ، علاوہ محصول ڈاک، فی پرچہ ۳ر، پتہ :- کشمیری بازار لاہور،

یہ رسالہ عرصہ سے جناب نشتر جالندھری کی ادارت میں نکلتا ہے، اب انھوں نے اس کو نئے اہتمام سے نکالا ہے، عالم نسواں اور بچوں کی دنیا کے تحت میں عورتوں اور بچوں کے مذاق کے مضامین کے مستقل ابواب ہیں یہ نیا دور پہلے دور سے بہتر ہے، لیکن ابھی اس کو عام ادبی رسائل کی سطح پر لانے کی مزید کوشش کی ضرورت ہے، ادبی مضامین تو خیر غنیمت ہوتے ہیں لیکن علمی مضامین کا معیار مزید توجہ کا محتاج ہے،

حرم، مرتبہ جناب سید عاشق علی صاحب بجنوری، تقطیع بڑی ضخامت ۴۸، صفحے، کاغذ اچھا، کتابت وطباعت معمولی، قیمت سالانہ :- عار، فی پرچہ ۲ر، پتہ :- دفتر حرم، کوچہ پنڈت دہلی،

یہ رسالہ حال ہی میں دہلی سے نکلا ہے، ہم نے اس کے چند نمبر دیکھے، ہر نمبر میں مفید و سنجیدہ علمی ادبی، تاریخی، اور مذہبی مضامین نظر آئے، عام رسائل کو دیکھتے ہوئے مضامین کا معیار بھی خاصہ ہے، "مشاہیر اسلام کے سوانح کا سلسلہ" "نئی دنیا عربوں نے دریافت کی"، "مدن پر انگریزوں کے قبضہ کی داستان"، "نپولین کی بہاوج" مفید مضامین ہیں افسانے بھی دلچسپ ہیں،

جدید اردو، مرتبہ جناب احمد حسن صاحب اشک تقطیع بڑی ضخامت ۴۸ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت نہایت معمولی، قیمت عہر، فی پرچہ ۳ر، پتہ نمبر ۴۳ ہارسڈن اسٹریٹ کلکتہ،

یہ ادبی رسالہ تقریبًا ایک سال سے کلکتہ سے نکلتا ہے، ابھی یہ کلکتہ کے اچھے ادبی رسائل سے بہت پیچھے ہے، مضامین معمولی ہوتے ہیں، لیکن امید ہی کہ وہ اپنی خامیوں کی اصلاح کرکے اپنے معاصرین کے برابر ہو جائے گا، ایسے رسائل کو چاہئے، کہ وہ اپنے مضامین کو ادبیات اور عام معلومات تک محدود رکھا کریں یہ رسالہ اس حیثیت سے قدر افزائی کا مستحق ہے، کہ وہ بنگال میں اپنی بساط کے مطابق اردو کی خدمت انجام دیتا ہے،

ہدایت، (ہفتہ وار) مرتبہ جناب عبد اللہ صاحب قریشی، تقطیع اوسط، ضخامت ۱۶ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت سالانہ :- صہ، ششماہی :- ۱۲؍، فی پرچہ ۱ر، پتہ :- دفتر رسالہ ہدایت لاہور،

جناب عبد اللہ قریشی نے بچوں کے لئے یہ رسالہ نکالا ہے، اس میں ان کی اخلاقی تربیت، تعلیمی ضروریات اور دلچسپی ہر چیز کا لحاظ رکھا گیا ہے، ان کی اخلاقی تربیت کے لئے اخلاقی اور سبق آموز باتیں، معلومات کے لئے تاریخی واقعات اور حالات، دلچسپی کے لئے دلچسپ قصے، حکایتیں اور لطائف دلچسپ پیرایے میں ہوتے ہیں، یہ رسالہ بچوں کے لئے دلچسپ بھی ہے اور مفید بھی،

"م"

مطبوعاتِ جدیدہ

تفسیر جواہر جزء اوّل، مترجمہ مولینا عبید الرحمٰن صاحب رحمانی استاذ جامعہ عربیہ دار السلام عمرآباد، تقطیع اوسط، ضخامت ۶۲۹ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت سے، علاوہ محصولڈاک، پتہ:۔ سکریٹری عمر لائبریری، عمرآباد، متصل آمبوڑ، شمالی آرکاٹ مدراس،

زمانہ کے تغیر کے ساتھ ہر دور کا مذاق، اور اس کی ضروریات بھی بدلتی رہتی ہیں، اس لئے ہر دور کی تفسیروں کا رنگ جدا ہے، اب پھر زمانہ کا مذاق بدلا ہے، یہ فلسفہ وحکمت، صنعت و حرفت، تجارت وسیاست کا دور ہے، اس لئے ان چیزوں کی روشنی میں تفسیر قرآن کی ضرورت تھی، یہ دور مفتی محمد عبدہ کے زمانہ سے شروع ہوا، اس دور کے مذاق، رجحان اور ضروریات کی ترجمانی مصر کے مشہور عالم شیخ طنطاوی جوہری کی "تفسیر جواہر" ہے، اس میں جدید علوم اور قوموں کے عروج وزوال کے فلسفہ کی روشنی میں اس طرح کلام اللہ کی تفسیر کی گئی ہے کہ وہ عقلی اور علمی حیثیت سے جدید مذاق کے لئے قابل قبول ہو، کلام اللہ کی تعلیمات، اور اس کے اسرار و حکم دل کے ساتھ دماغ کو بھی اپیل کر سکیں، کلام اللہ کے پیش کردہ عجائبات فطرت جدید علوم کی تحقیقات پر پورے اتریں، مسلمانوں میں اپنے تنزل کا احساس، جدید علوم وفنون کی تحصیل اور دنیاوی عروج وترقی کا ولولہ پیدا ہو، اس تفسیر میں جدید رجحانات کے تمام پہلوؤں کا پورا لحاظ

رکھا گیا ہے، اس کے ساتھ کہیں سے صحیح اسلامی عقائد کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹنے پایا ہے، مولینا عبید الرحمٰن صاحب شکریہ کے مستحق ہیں، کہ انھوں نے اس مفید تفسیر کو اردو کا جامہ پہنایا، ترجمہ صاف اور سلیس ہے، پہلی جلد میں سورۂ بقر کی تفسیر ہے، یہ تفسیر اس لائق ہے، کہ جدید تعلیم یافتہ خصوصیت کے ساتھ اس کا مطالعہ کریں،

مرقعِ سخن جلد دوم شائع کردہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد، تقطیع بڑی ضخامت ۴۳۱ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مرقوم نہیں، پتہ:۔ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن،

آج سے تقریبًا ڈیڑھ دو سال پہلے ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد "مرقع سخن" کے نام سے دکن کے آصفی دور کے پچیس نامور شعراء کا تذکرہ شائع کر چکا ہے، مذکورۂ بالا تذکرہ اس کا دوسرا حصہ ہے، اسکی خصوصیات اور دوروں کی ترتیب وہی ہے، جو پہلے حصہ کی تھی یعنی ۱۱۵۰ھ سے لیکر ۱۳۵۵ھ تک پانچ دور قائم کئے گئے ہیں، اس حصہ میں چھٹا دور نوجوان شعراء کا نیا ہے، پہلے حصہ میں پچیس شعراء کا تذکرہ تھا، اس میں پچاس کا ہے، ہر دور کے آغاز میں ایک تمہید ہے، جس میں اس عہد کے دکن کے قدردان سخن امراء کے نام اس دور کی شاعری کی مختصر خصوصیات، دکن کے دوسرے شعراء کی فہرست، باہر سے دکن آنے والے شعراء اور شمالی ہند کے مشہور شعراء کے نام ہیں، پھر اس دور کے دکن کے نامور شعراء کے حالات، ان کے کلام پر مختصر تبصرہ، اس کا نمونہ اور ان کی تصانیف کا تعارف ہے، ہر شاعر کے حالات جامعہ عثمانیہ کے مختلف صاحب قلم اساتذہ اور طلبہ نے کاوش سے لکھے ہیں، جہاں تک ہو سکا ہے، صاحب تذکرہ شعراء اور قدردان سخن امراء کی تصویریں بھی دیدی گئی ہیں، اب بھی دکن کے بہت سے شعراء کے تذکرہ کی ضرورت باقی ہے، لیکن فی الجملہ ان دونوں حصوں میں دکن کی اردو شاعری کی تاریخ بڑی حد تک آگئی ہے،

شہزادہ زرتاش، از جناب سید حمید علی صاحب، تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۰ صفحے،

کاغذ کتابت وطباعت بہتر مجلد قیمت عہ، پتہ:۔ دار الاشاعت پنجاب لاہور،

عہدِ جدید کے بہت سے وہ اکتشافات جنھیں لاعلمی کی وجہ سے اس دور کا کارنامہ سمجھا جاتا ہے، آج سے صدیون پہلے ہو چکے تھے، اس میں ایک شاہزادہ زرتاش کی داستان ہے، اس میں ملیریا کی ہلاکت آفرینی اس کے پھیلنے کے اسباب اس سے بچنے کے طریقوں، اور اس کے علاج کو داستان کی شکل میں بیان کیا گیا ہے، یہ داستان مؤلف کو انڈیا آفس لائبریری میں مشرقی قصص وحکایات کی کتابوں میں ملی تھی، جسے انھوں نے اپنی زبان میں دلچسپ افسانہ کی شکل میں پیش کیا ہے، اگرچہ یہ خشک موضوع ہے، لیکن مشرقی داستانوں کی تخیل آرائی اور مؤلف کے حسنِ مذاق دونوں نے مل کر اس خشک موضوع کو ایسا دلچسپ بنا دیا ہے، اور اس میں قدیم مشرقی افسانون کی تمام خصوصیات اتنی مکمل موجود ہیں، کہ کہیں سے اس کی افسانویت میں فرق نہیں آیا ہے، کہین آخر میں جاکر اصل مقصود کا پتہ چلتا ہے، اگر سید حمید صاحب نے اس داستان کے اصل مؤلف اور اس کے زمانہ کا تعین کر دیا ہوتا، تو اس کتاب کی قدر و قیمت اور بڑھ جاتی، بہرحال یہ داستان افسانہ کی حیثیت سے کامیاب اور حفظانِ صحت کے لحاظ سے مفید کتاب ہے،

نقد سخن از نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز تقطیع چھوٹی ضخامت ۷۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت عہ، پتہ:۔ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن،

حیدرآباد کے نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز داغ کے تلامذہ میں ہیں، انھوں نے غالباً حیدرآباد کے کسی رسالہ میں باقیات فانی پر تنقید لکھی تھی، جسے ادارہ ادبیات اردو نے نقد سخن کے نام سے کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے، ہم نے اُسے بغور دیکھا، نواب صاحب کی سخن سنجی میں کوئی شبہہ نہیں، لیکن اس تنقید میں ان کا قلم جادۂ اعتدال سے بہت ہٹ گیا ہے، موجودہ دور کے بعض ممتاز شعرا کے کلام کا یہ مشترک نقص ہے، کہ وہ خیالات کی رو میں زبان کی صحت وسلاست اور طرز ادا کے سلجھاؤ کا لحاظ نہیں رکھتے، اس سے بعض اوقات معنی میں بھی سقم پیدا ہو جاتا ہے اور عیب چین نگاہون کو اعتراض کا موقع مل جاتا ہے، فانی کا کلام بھی اس عیب سے خالی نہیں ہے، نقد سخن کے اکثر اعتراضات اسی قبیل کے ہیں، بعض میں محض خوردہ گیری کی گئی ہے، بعض اشعار کا مطلب غلط لیکر اعتراض کیا گیا ہے، بعض اعتراضات صحیح بھی ہیں، لیکن ان کی تعداد کم ہے، غرض یہ تنقید خود ایک تنقید کی محتاج ہے جس کی اس مختصر ریویو میں گنجایش نہیں، ورنہ اس اجمال کی تفصیل بیان کیجاتی، لیکن تنقید ایک سخن سنج اور صاحب نظر کے قلم سے نکلی ہوئی ہے، اس لئے اس میں زبان اور شاعری سے متعلق بہت سے ادبی نکات آگئے ہیں، جن کا مطالعہ نو مشق شعرا میں ادبی بصیرت پیدا کرے گا،

عدلِ جہانگیری، مصنفہ پروفیسر عبد القوی صاحب فانی، ایم اے، تقطیع بڑی ضخامت ۶۳ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت ۸؍ علاوہ محصولڈاک بہت زیادہ ہے، پتہ:۔ دفتر البیان محمود نگر، لکھنو،

ہندوستان سے فارسی شاعری بلکہ فارسی ادب کا ذوق روز بروز مٹتا جاتا ہے، خال خال اس سے ذوق رکھنے والے نظر آتے ہیں، اس میں ایک پروفیسر عبد القوی صاحب فانی لکچرار لکھنو یونیورسٹی ہیں ان کی متعدد نظمیں فارسی میں شائع ہو چکی ہیں، مثنوی عدل جہانگیری میں انھون نے عہد جہانگیر کے اس مشہور عام واقعہ کو نظم کیا ہے، کہ ایک مسلمان کوتوال سعد اللہ خان نے ایک ہندو کی حسین وجمیل بیوی پر زبردستی قبضہ کرنا چاہا تھا، اس کی ضعیفہ ساس کی فریاد پر جہانگیر خود اس کے گھر گیا، اور کوتوال کو گرفتار اور قتل کر کے ضعیفہ کو عطوفت شاہانہ سے نوازا، اس مثنوی میں قند پارسی

کا پورا لطف ہے، لیکن نظم کی زبان کے مقابلہ میں دیباچہ کی نثر مخمل میں ٹاٹ کا پیوند معلوم ہوتی ہے، اس کا نہ ہونا ہی بہتر تھا،

رشحات القرآن، مرتبہ مولوی ذکاراللہ خاں صاحب ایم اے ریٹائرڈ کلکٹر، نائب دیوان ریاست دتیا، پتہ: لطیفی پریس، دہلی دروازہ، دہلی،

اس رسالہ میں مرتب نے کلام اللہ سے دلائل توحید، رحمت باری، اثبات رسالت، اتباع رسول، اور اعجاز القرآن وغیرہ، سترہ مضامین کی آیات منتخب کرکے ترتیب کے ساتھ مع ترجمہ جمع کردی ہیں، کہیں کہیں اپنے ذوق سے ان آیات سے مستنبط فوائد بھی لکھ دیے ہیں، کتاب مفید ہے،

یار غار، مؤلفہ جناب محمد ظفر صاحب ایم ایل ایل بی، تقطیع جیبی ضخامت ۱۲۸ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت نہایت معمولی، ۱/ کا ٹکٹ بھیجکر انجمن رفیق الاسلام گوڑ گاوان پنجاب سے منگایا جاسکتا ہے،

انجمن رفیق الاسلام گوڑ گاوان مسلمان بچوں کی اخلاقی اور مذہبی تعلیم و تربیت کے لئے اکابر اسلام کے مختصر سوانح اور چھوٹے چھوٹے مذہبی رسالے شائع کرکے مفت تقسیم کرتی ہے، یہ مختصر رسالہ بھی اسی کی ایک کڑی ہے، اس میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مختصر حالات ہیں، اس رسالہ کی ظاہری شکل بہت خراب ہے، لیکن اس شکل میں بھی مفت تقسیم کرنا بڑی ہمت کا کام ہے،

سعی ناکام، مترجمہ امت الرفیق صاحبہ، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۱۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۸/ پتہ دار الترجمہ متصل سنہری ہوشیارپور پنجاب،

ڈنمارک کے مشہور افسانہ نگار ہینز اینڈرسن کے آٹھ افسانوں کا ترجمہ ہے، اس کے افسانوں میں تخیل کی دلکشی کی وجہ سے کہانیوں کا لطف آتا ہے اسلئے بچوں کیلئے خصوصیت کیساتھ زیادہ دلچسپ ہوتے ہیں، افسانوں کا حسن انتخاب اور ان کا کامیاب ترجمہ ہونہار مترجمہ کیلئے فال نیک ہے، "م"

جلد ۴۳	ماہ ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۳۹ء	عدد ۲

مضامین